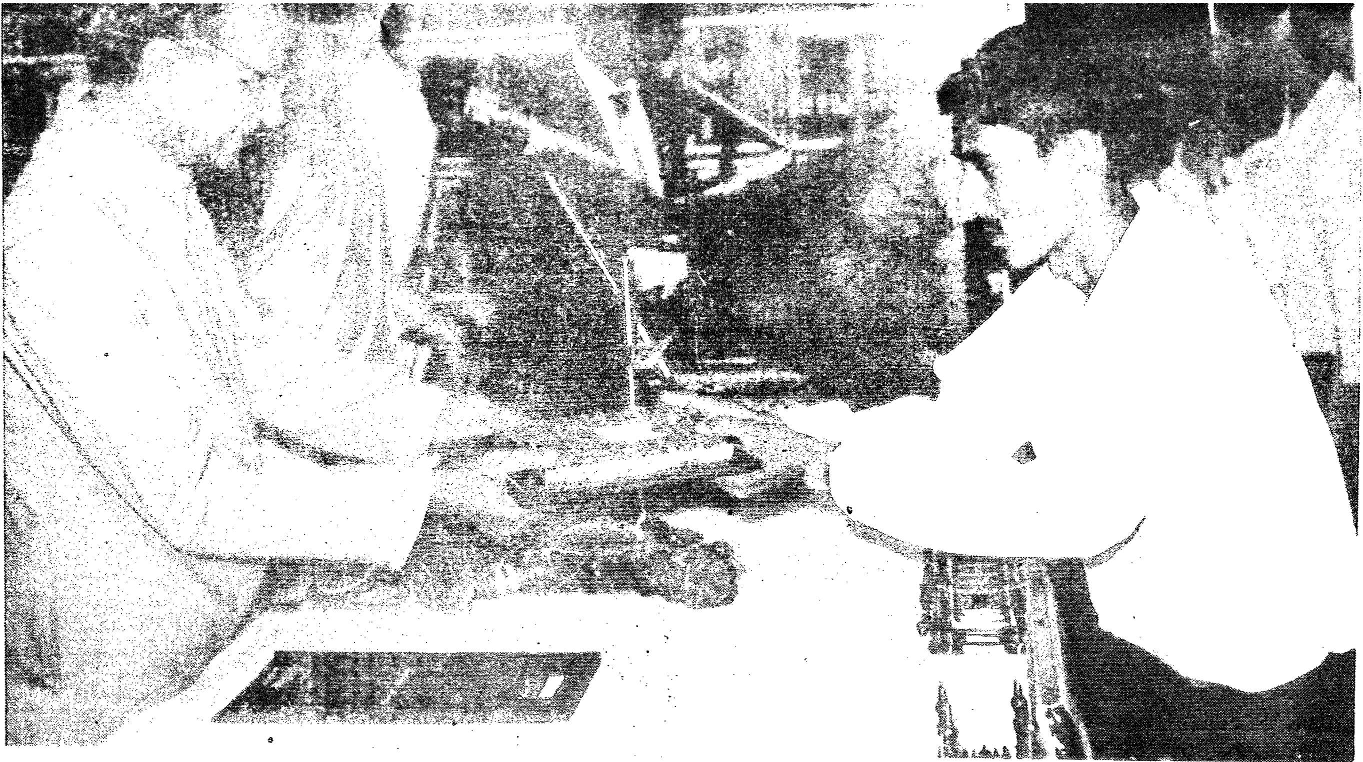
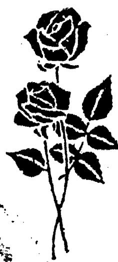


موسیٰ اقبال، جناب عابد علی خاں، مدیر اعلیٰ روزنامہ سیاست سے تقریری مقابلے میں انعام اول حاصل کرتے ہوئے،
جناب لطیف الدین صاحب معتمد سرور ڈانڈا میموریل سوسائیٹی بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

# جہاں دار افسر

## حیات اور خدمات





مصنف

**موسیٰ اقبال**

ڈی فارما (بنگلور) ایم۔اے۔ایم۔فل، پی۔ایچ۔ڈی (ریسرچ اسکالر) عثمانیہ یونیورسٹی

نام کتاب : جہاں دار افسر حیات اور خدمات

مصنف : محمد موسیٰ قریشی

قلمی نام : موسیٰ اقبال

سنہ اشاعت : جنوری ۲۰۰۲ء

تعداد اشاعت : ۵۰۰

کمپیوٹر کتابت : یونیورسل کمپیوٹرس، کالے پتھر، حیدرآباد، وارثی گرافکس، چھتہ بازار، حیدرآباد

طباعت : سائی رام پروسیسر، سویز شلٹرس، لکڑی کا پل، حیدرآباد ۔۴

سرورق : تصویر جہاں دار افسر

زیر اہتمام : محمد اکبر علی خان ، وارثی گرافکس، چھتہ بازار، حیدرآباد

ناشر : صفی سوسائٹی، مغل پورہ، حیدرآباد

قیمت : 100 روپے

کتاب ملنے کا پتہ :

☆ موسیٰ اقبال، مکان نمبر 19-2-197/42 ، نزد نہرو زولوجیکل پارک، رنمست پورہ، حیدرآباد 500064، فون : 4478817

☆ خانقاہِ کمالیہ، جامع مسجد حنظلہ، اقبال کالونی پھول باغ، حیدرآباد، فون: 4462883, 4471617

☆ پیپلز نیوز سرویس، کمان مغل پورہ، حیدرآباد،

☆ وارثی گرافکس، فرسٹ فلور، جمال مارکٹ، چھتہ بازار، حیدرآباد فون: 4564994

# انتساب

میں اپنے اس اولین قلمی و تحقیقی پیشکش کو والدِ محترم حضرت محمد غلام رسول صاحب اور والدہ محترمہ کے علاوہ برادرِ حقیقی الحاج محمد ظہیر الدین صاحب اور رفیق دیرینہ جناب الحاج سید نصیر الدین حال مقیم جدہ کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں۔

جن کی شفقت اور سرپرستی مجھے علم و فن کی دنیا میں شعور مندی کے ساتھ سانس لینے کا ادراک بخشا۔

"گر قبول اُفتد زہے عِزو شرف"



# فہرست

# حرفِ آغاز

صاحب زادہ جہاں دار افسؔر ایک مقبول عوامی لیڈر' نامور صحافی' ایک معتبر شاعر ہونے کے علاوہ ایک مخلص انسان بھی ہیں آصفی خاندان میں جنم لینے اور منہ میں سونے کا چمچہ لیئے پیدا ہونے کے باوجود اُن کا گہرا تعلق بائیں بازو کی تحریکوں اور کمیونسٹ پارٹی سے رہا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی سے اس وقت وابستہ ہوئے جب ان کی عمر صرف سترہ ۱۷ سال ابتک ''وفاداری بہ شرط استواری'' کا ایک چلتا پھرتا نمونہ بنے ہوئے ہیں یہی نہیں بلکہ حیدآباد کی تمام ترقی پسند' انقلابی اور فلاحی تحریکوں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے انھوں نے مجبوروں' بے کسوں اور لاچاروں کے لئے اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی کبھی دریغ نہیں کیا۔ بھوک ہڑتالیں کیں' پولیس کے ظلم سہے' جیل گئے مگر اپنے مقصد سے کبھی منہ نہیں موڑا۔ نہ دل برداشتہ ہوئے۔ آج بھی ان میں نوجوانوں کا ساجذبہ عمل ہے جبکہ وہ اپنی عمر کے ۷۵ سال میں ہیں۔ وہ کام ہی کو اس کا انعام سمجھتے ہیں انھیں کئی ایوارڈز ملے ان کی اعتراف خدمات کا شاندار جشن بھی منایا گیا اور کیسہ زر بھی پیش کیا گیا مگر وہ مطمئن ہو کر بیٹھے نہیں رہے۔ صاحبزادہ جہاں دار افسؔر نے اپنی ساری زندگی حیدرآباد کے پرانے شہر کے بارے میں سوچتے ہوئے گزار دی ہے۔ وہاں کی علمی ادبی سماجی اور سیاسی زندگی میں مقدور بھر شامل رہے ہیں۔

وہ دو مرتبہ مغلپورہ کے کونسلر رہے اس حلقے کے بیش تر فلاحی کام انھیں کی کدوکاوش کا نتیجہ ہیں ان کے کردار کی بلندی کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ آج بھی پرانے شہر کے ایک افتادہ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں ان کے لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی ہے۔ حالانکہ کئی قیامتیں ان پر ٹوٹ چکی ہیں۔ شفیق رفیق حیات کا ساتھ چھوٹا' فرزند عزیز نے عین عالم شباب میں داعی اجل کو لبیک کہا مگر ان کے لبوں سے کچھ نکلا تو بس اتنا کہ

کیوں بندگانِ عام سے یہ سخت امتحاں
پروردگار یہ تو رسولوں کی بات ہے

ابھی انھوں نے ہوش ہی سنبھالا تھا کہ ان کی آبائی وسیع وعریض جائیداد اور کوٹھی نیلام ہوگئی۔ کوڑیوں کے مول بکنے والی زمینوں کو بھی وہ خرید نہ سکے کیوں کہ زمین خرید کر مکان بنانے کی حیثیت نہیں تھی تب سے اب تک ان کے نشیب و فراز نے کوئی پلٹا نہیں کھایا۔ آج بھی وہ اپنے قلم اور عمل سے عوام کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں ایک مقبول سیاسی رہنما اور ایک نامور صحافی ہونے کے ناطے انھوں نے خدمت خلق کا کام مسلسل کیا ہے۔ اور آج بھی کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ راستہ بہ حالت مجبوری نہیں بہ خوشی اختیار کیا ہے۔ اور اس کی قیمت بھی ادا کی ہے۔ صاحبزادہ جہاں دار افسرؔ پیشہ ور انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ پیشہ ور صحافی بھی ہیں۔ اس محاذ پر بھی حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ عوام کے حقوق اور مفادات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

صاحبزادہ جہاں دار افسرؔ ایک معتبر اور ممتاز شاعر ہیں۔ وہ حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے بلند پایہ شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں انھوں نے جہاں حضرت صفیؔ کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا وہیں ان سے علم عَروض بھی سیکھا اور اپنی شاعری کو زندگی آمیز اور زندگی آموز بنانے کی کامیاب کوشش کی وہ ہمیشہ ترقی پسند تحریک کے طرف دار رہے اسی لئے ان کی شاعری میں عام لوگوں کی زندگی کا کرب ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عام لوگوں کے بہتر مستقبل کے خواب بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ ان کے شعری مجموعے کا نام ''کُھلی آنکھوں کے خواب'' ہے انھوں نے ہمیشہ اپنی ذہنی کھڑکیاں کھلی رکھیں تاکہ نئی زندگی کی نئی ہوا اور نئی روشنی سے وہ دور نہ رہیں ان کی شاعری میں جو سماجی شعور جھلکتا ہے وہ ترقی پسند کی ہی دین ہے اور اس سے وابستگی کا نتیجہ ہے۔

آصفی خاندان کے وہ صاحبزادے جنھوں نے حیدرآباد کی علمی ادبی صحافتی اور سماجی زندگی پر اپنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان میں صاحب زادہ محمد علی خاں میکشؔ کے بعد سرفہرست صاحبزادہ جہاں دار علی خاں (جہاں دار افسرؔ) ہیں۔ صاحبزادہ میکشؔ کی ادبی خدمات پر تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ لیکن صاحبزادہ جہاں دار افسرؔ کی خدمات پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا زیر نظر

کتاب اس کمی کو پورا کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے اس میں صاحبزادہ جہاندار افسؔر کی حیات شخصیت ان کے شعری سرمایہ کا اجمالی تعارف کے علاوہ ان کی غزل گوئی، نظم نگاری، قطعات نگاری کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے کلام اور خصوصاً اور ان کی غزلوں اور نظموں کے عروضی اور صوتی آہنگ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ان کا کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی پیش ہے جو ان کے مجموعہ کلام ''کھلی آنکھوں کے خواب'' میں شامل نہیں ہے۔ پھر صاحبزادہ جہاندار افسؔر کی صحافتی خدمات کا سیر حاصل جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ جہاں دار افسؔر ایک اچھے صحافی، ایک بلند پایہ کالم نگار اور ایک ماہر اداریہ نویس کی حیثیت سے صحافتی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں انھوں نے برسوں روزنامہ سیاست میں سب ایڈیٹر اور اسٹاف رپوٹر کی حیثیت سے کام کیا اداریے لکھے اور شیشہ و تیشہ کا کالم لکھا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے آجکل وہ روزنامہ منصف میں کالم نگار کی حیثیت سے اپنی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۲۰ رآگسٹ ۱۹۹۸ء سے ''حیدرآباد دیدہ وشنیدہ ۔ مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا'' کے زیر عنوان ادبی کالم لکھتے رہے ہیں اس کالم کی پچھتر سے زائد قسطیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ پھر اس کے بعد وہ ''چار مینار کے دامن میں'' سرخی سے کالم لکھ رہے ہیں جو ہر جمعرات کو شائع ہوتا ہے۔

ان کے کالم عوامی و ادبی حلقوں میں مقبول ہیں اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ صاحبزادہ جہاں دار افسؔر کے بارے مختلف مشاہیر کی گراں قدر آراء بھی شامل کتاب ہیں ۔ آخر میں ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے اس مقالہ کی تیاری اور جہاں دار افسؔر کی حالات زندگی اور شخصیت کے بارے میں مواد ان کے دوست احباب سے مل کر جمع کیا گیا ہے۔ جو کسی اور ذریعہ سے ممکن نہ تھا یہ میری پہلی علمی ادبی وتحقیقی کاوش ہے جیسے میں بڑے عجز وانکسار کے ساتھ علمی دنیا کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، مجھے اپنی تحقیق کے بارے میں جامعیت کا دعویٰ ہے اور نہ ہو سکتا ہے، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ صاحبزادہ جہاں دار افسؔر کی علمی وصحافتی خدمات پر پہلی بار سیر حاصل روشنی ڈالنے کی کوشش

کی گئی ہے۔ اس میں کہاں تک کامیاب رہا اس کا فیصلہ قارئین ہی پر چھوڑتا ہوں۔

اس کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں، میں اپنے اساتذہ خصوصاً پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز (شعبۂ اردو) عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر بیگ احساس صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، و پروفیسر غیاث متین کے علاوہ محترم میر احمد علی المعروف الھام واحدی صاحب کے گراں قدر مشوروں اور اپنے والدین و تمام افراد خاندان بلخصوص برادر محترم محمد ظہیر الدین صاحب کا بیحد ممنون ہوں، خصوصاً برادرم ظہیر الدین صاحب نے ابتداء ہی سے ہر وقت میری انتہائی جوصلہ افزائی اور میری سرپرستی کی آج میں جو کچھ بھی ہوں انھیں کی محنتوں کا نتیجہ ہے میں اپنے دیرینہ رفیق سید نصیر الدین (حال مقیم جدہ) اور سید محمد عمیر رضوی (بی فارما، بنگلور) کا بھی بیحد ممنون جنھوں نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی، میں محترم پروفیسر سلیمان اطہر جاوید صاحب کا پیش گفتار کے لئے، ممتاز شاعر محترم مضطر مجاز صاحب کا پیش لفظ کیلئے ''شخص وعکس موسیٰ اقبال'' کے لئے استاد محترم حضرت مولانا شیخ کریم الدین عابد چشتی القادری، و تہنیتی قطعات کیلئے محترم دلاور علی حزیں کا بے حد شکر گزار ہوں، آخر میں سید عارف علی (ڈائرکٹر یونیورسل کمپیوٹر) اور جناب حافظ محمد عماد الدین کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے قلیل مدت میں اس کتاب کی کمپوزنگ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دی اور سرورق کے لئے محمد اکبر علی خان، وراثی گرافکس، چھتہ بازار کا بھی شکر گزار ہوں۔

موسیٰ اقبال

# پیش لفظ

صاحبزادہ میر محمد جہاں دار علی خاں جو جہاں دار افسر کے مختصر سے ادبی نام سے مشہور ہیں، کا تعلق حیدر آباد کے حکم راں شاہی خاندان سے ہے، خان وادہ آصفی سے ان کا راست نسبی تعلق ہے لیکر انھیں اس پر ایسا کوئی ناز نہیں بلکہ ان کی ''کارگذاریوں'' اور کارستانیوں سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس تعلق سے زیادہ خوش نہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ حیدر آباد کے شاہی خاندان کی حکمرانی کے زوال کے ساتھ ہی افسر صاحب کے شعور کی آنکھیں بھی کھلیں یہ وہی زمانے تھا جب حیدر آباد کی کمیونسٹ تحریک مخدوم محی الدین کی سرکردگی میں بڑی تیزی سے نوجوان طبقے میں پھیلتی جارہی تھی۔ افسر صاحب بھی بہ عمر سترہ سال اس کاروان میں شامل ہو گئے اور ان کی ساری توانائیاں جاگیرداری سماج کے خلاف جدوجہد پر صرف ہونے لگیں فرعون کے گھر میں موسیٰ اس طرح پیدا ہوتے رہے ہیں اور یہی کچھ قانون قدرت ہے جو ازل سے جاری ہے لیکن جہاں دار صاحب کے کردار کا یہ پہلو بڑا عجیب ہے بلکہ ممکن ہے کچھ لوگوں کو اس میں تضاد یا تناقض بھی نظر آئے لیکن دراصل اس میں ان کی نظروں کی بلندی کا اثر زیادہ ہے اور ''حوصلے کی پستی'' والی کوئی بات نہیں اور وہ یہ کہ انھوں نے اپنے پرکھوں اور اپنی آبائی طرز معاشرت کی خوبیوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ''خذ ما صفا اور دع ما کدر'' کے اصول کے تحت انھوں نے اس سماج کی خوبیوں کو بھی اپنے پیش نظر رکھا بلکہ اپنی زندگی میں برتاو بھی یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں کبھی بھی ایک مضامیں پیدا نہیں ہوا۔ جہاں انھوں نے ساری حکیمانِ سیاست کی ضرد افروزی سے استفادہ کیا وہیں اپنے پرکھوں کی سینہ افروزی کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا اگرچہ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے ان کا حساس ضمیر انہیں کسی اور ہی راہ پر لے چلا اس طویل سفر میں کتنے ہی لوگوں نے اپنے نظریاتی کنچلیاں اتار پھینکیں مگر افسر صاحب نے اپنے چنے ہوئے راستے اور اس کے مقاصد کو اپنا جزو بدن بنالیا ان کے لیے گوشت کا ناخن سے جدا ہونا تھا جس پر وہ کبھی تیار نہیں ہوئے اور آج تک اپنا عہد وفا نبھاتے ہوتے ہیں۔

محکوموں، مجبوروں اور لاچاروں سے تعلق مسائل و مصائب کیلیے انھوں نے جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ بھوک ہڑتالیں، پولیس کے ڈنڈے کھائے، جیل گئے، مگر اپنے مقصد سے کبھی منہ نہ موڑا نہ دل برداشتہ ہوئے۔ آج بھی ان میں نوجوانوں کا سا جذبہ عمل ہے، وہ کام ہی کو اس کا انعام سمجھتے ہیں، کام کے نتیجے یا کامیابی اور ناکامی کو نہیں ان کے کانوں پر دکن کے ایک ولی اللہ کی رکعت ان کے بچپن ہی سے پڑ گئی تھی کہ ۔

کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے

کام کرنا ہی کامیابی ہے

آج بھی عمر کے پچھتر سال ان پر نوجوانوں کا سا جذبہ عمل ہے اور غالباً یہی ان کی صحت کا راز بھی ہے۔ حیدرآباد کا قدیم شہر، جو اصل حیدرآباد ہے، جو دراصل مستضعفین کی بستی ہے اس کی خوش حالی اور ترقی کیلیئے ان کی ساری کاوشیں وقف رہیں وہ بلدیہ حیدرآباد کے دومرتبہ کونسلر منتخب ہوئے لیکن وہ سیاست گری میں مبتلا ہوکر بڑے بڑے عہدوں کی لالچ میں نہیں پڑے اس موقعہ کو انھوں نے خلق خدا کی خدمت کا موقع سمجھ کر کام کیا اپنی ذاتی منفعت کبھی پیش نظر نہیں رکھی ان کے کردار کے کھرے پن کی سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ وہ آج بھی پرانے شہر کے ایک افتادہ کرائے کے مکان میں اپنے صاحب زادے کیساتھ مقیم ہیں ان کی شخصی زندگی میں بڑی بڑی قیامتیں ٹوٹیں، رفیق حیات کا ساتھ چھوٹا، ایک صاحب زادے نے عین عالم شباب میں داعیِ اجل کو لبیک کہا مگر ان کے لبوں سے نکلا تو بس اتنا کہ ۔ پرودگار یہ رسولوں کی بات ہے

آج بھی مسکراہٹ ان کے چہرے کا جزِ لاینفک ہے شکست کا لفظ ان کی لغت میں شامل ہی نہیں ہوا۔ ابھی انہوں نے ہوش ہی سنبھالا تھا کہ ان کی آبائی کوٹھی کی وسیع وعریض جائیداد نیلام ہوگئی۔ تب سے اب تک ان کے شب وروز نے کوئی پلٹا نہیں کھایا۔ ایک طرح سے وقت منجمد سا ہوگیا، مگر ان کا حوصلۂ حیات کبھی منجمد نہیں ہوا، ان کی زندگی ایک دریائے پرخروش کی طرح کوہ ودمن اور

پست و بلند سے ٹکراتی ہوئی ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی کی تلاش میں بڑھتی ہی رہی۔ صبر اور استقامت ان کے کردار کی بلند و بالا عمارت کے بڑے مضبوط ستون ہے جنھوں نے بڑے بڑے زلزلوں کو بھی اس عمارت کی ایک اینٹ کو بھی ہلنے نہیں دیا۔

اس نواح شہر میں جہاں وہ شروع ہی سے اقامت گزیں ہیں سیاست نے مذہب کا استحصال کر کے بڑے بڑے گل کھلائے مگر وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ ڈٹے رہے طوفان آ آ کر اپنا سر ٹکراتے رہے اور پلٹ گئے۔ اگر وہ اس ریلے میں بہہ جاتے تو منسٹر نہ سہی، اسمبلی کے ممبر ضرور بن گئے ہوتے مگر ایمان کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں ۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کوئی مذہب بیزار شخص ہیں لیکن اس جنگ کے انجام سے بخوبی واقف ہیں جس میں ملا غازی ہوتا ہے! اب دین کا استحصال کر کے اپنی دنیائیں بنالی ہیں وہ سارے تماشے بھی ان کے سامنے ہیں مگر ۔ دیکھنا اہل دل نے کس دن اٹھا کے آنکھ
انھیں شعار مذہبی کا پورا پاس ولحاظ ہے۔ فریضہ حج سے بھی وہ مشرف ہو چکے ہیں لیکن وہ مذہب کو حصول زر یا حصول اقتدار کا ذریعہ بنانا پسند نہیں کرتے۔ دین کا یہ دنیا دارانہ فلسفہ بھی ان کے حلق سے نہیں اترا اس ساری عملی اور جہد آزما زندگی گذارنے کے باوجود انھوں نے اپنے آپ سے مکالمہ بھی جاری رکھا جس کا حاصل ہے ان شعری مجموعہ ''کھلی آنکھوں کے خواب'' یہ عنوان بڑا بامعنی ہے وہ خواب زندگی بھر دیکھتے رہے ہر باشعور فنکار کی طرح، لیکن کھلی آنکھوں سے ''ان کا شاعری کی تخیل کی چڑی ماری اور ردیف کو چمکانے یا قافیے کو گرمانے (برمانے) سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ان کا فلسفہ حیات ان کی شاعری میں خونِ حیات بن کر دوڑ رہا ہے حیرت ہوتی ہے اتنی جہد و عمل سے بھرپور زندگی گذرنے کے باوجود انھوں نے کمیت سے نہ سہی کیفیت کے اعتبار سے شعورِ سخن کا ایک وقیع سرمایہ ہمارے حوالے کیا ہے۔

فی زمانہ موضوعات سے زیادہ شخصیات پر تحقیق کرنے کا رواج ہماری جامعات میں بہت عام ہوگیا ہے کہ یہ کام بہت سہل بھی ہے اور اس کوشش میں عام طور پر ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو کبھی بھی منتخب کئے جانے کے قائل نہیں رہی۔

اس تناظر میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ عزیزی موسیٰ اقبال اس کام کے لئے جناب جہاں دار افسر کا انتخاب کیا ہے تو خوشی ہوتی ہے کہ افسر صاحب پر کام کرنا ایک دور پر کام کرنا ہے کہ بقول حالی وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے حیدرآباد کی سیاسی، سماجی، معاشی اور ادبی زندگی کے کئی ادوار دیکھے ہیں یہ نہیں کہ وہ صرف دور کے تماشائی رہے ہوں بلکہ ''یہ ہم غلطاں وباموجش در آویز'' پر عمل بھی کیا ہے۔ ان پر کام کرنا کئی ادوار پر کام کرنا ہے۔ اور یہ کام اس اسکالر نے بہ احسن الوجوہ انجام دیا ہے اور حق ادا کر دیا ہے۔

''ایں کار راز تو آید تو مرداں چنیں کنند!''

مضطر مجاز

# پیش گفتار

حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی زندگی جن چند پیکروں میں ڈھلی ملتی ہے ان میں سے ایک کا نام جہاں دار افسر ہے انتہائی متمول گھرانے میں آنکھ کھولی۔ خانوادہ آصفی سے تعلق کے باوجود عوامی، ٹھیٹ عوامی رنگ ڈھنگ اختیار کئے اور ان آزادہ وخودبیں لوگوں میں رہے جو اجالے دے کے اندھیرے خرید لیتے ہیں۔ نہ کبھی شاہی خاندان سے وابستگی پر افتخار کیا اور نہ اپنے آباواجداد کے عزوجاہ اور ان کی شان وشوکت کی تختی اپنے سینے پر لگائی جب سے شعور آیا بے نواؤں اور بے کسوں کے ہمدوش اور ہمقدم رہے، عوامی تحریکات کا ساتھ دیا اور قلم کی مزدوری کی اور کرتے رہے۔

جہاں دار افسر کی حیات، شخصیت اور فن کا مطالعہ، دراصل حیدرآباد کے ایک مخلص دور اور اس دور کے ایک مخصوص رخ کا مطالعہ ہے قربانی اور ایثار کی کہانی اور خدمتِ خلق کے جذبے کو عام کرنے کی سعی ہے۔ عوامی زندگی کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کا حوصلہ ہے۔ عزم و ہمت کی داستاں کو عام کرنا ہے۔ جواں مردی اور سرفروشی کی کہانی کو سنانا ہے۔ خوشی اس امر کی ہے کہ آخر یہ کام عمل میں آیا۔

جہاں دار افسر، ایک آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے، لوگ جس کی تمنا کرتے ہیں لیکن عوام کے دکھ درد کے احساس کے باعث انہوں نے اس زندگی سے بخوشی کنارہ کشی کی اور ستائش و صلہ کی تمنا کے بغیر ایک عام فرد کی طرح ساری زندگی گزاری۔ سیاست میں حصہ لیا اور صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ حیدرآباد کے کئی روزناموں میں کام کیا اور آسمان صحافت پر کئی ستارے جڑ دیئے۔
انہوں نے اپنے قلم کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو حیدرآباد کی تاریخ اور عوامی زندگی اور تہذیب کے موضوعات ہیں۔ صرف سنی سنائی نہیں لکھی، وہی لکھا جس کو وہ دیکھ چکے تھے، برت

چکے تھے۔آزما چکے تھے۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں زندگی دمکتی، چہکتی اور مہکتی ملتی ہے۔ ان کی ایسی تحریروں کو بھی ترتیب دیا جانا چاہیے۔ ان کی اشاعت عمل میں آنی چاہئے۔ حیدرآباد میں اردو صحافت کی تاریخ میں بھی جو چند نام روشن ہیں ان میں سے ایک جہاں دار افسر کا ہے کہ انہوں نے صحافت کو ادب سے قریب کردیا۔

شاعر کی حیثیت سے بھی جہاں دار افسر کا اپنا مقام و مرتبہ ہے۔ اپنی صحافتی، سیاسی اور تہذیبی مصروفیات کے باعث جہاں دار افسر نے شاعری پر ظاہر ہے توجہ نہیں دی۔ ہمارے کئی سیاستدانوں اور صحافیوں کے تعلق سے سانحہ یہی رہا کہ وہ اپنی شعری اور ادبی مصروفیات کا حق ادا نہیں کرپاتے۔ تاہم جہاں دار افسر نے ۱۹۹۴ء میں اپنا شعری مجموعہ ''کھلی آنکھوں کے خواب'' شائع کیا۔ ہمارے موقر اخبارات وغیرہ میں ان کی تخلیقات پڑھنے کو ملتی ہیں اور شاعروں سے دلچسپی رکھنے والے ان کو سنتے بھی ہیں۔جہاں دار افسر کی شاعری، شاعری کیا ہے ان کی سیاسی، صحافتی اور تہذیبی زندگی پر جس کو انہوں نے منظوم کردیا۔ان کے موضوعات ہی عوامی نہیں بلکہ انہوں نے عوامی جذبات کو پیش کردیا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ زبان و بیان اور لہجہ پر بھی عوام کا اثر واضح ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عوامی تحریکات سے وابستگی کا نتیجہ ہے اور میں تو کہوں گا کہ بحیثیت شاعر ان کی مقبولیت اور کامیابی کا راز یہی ہے۔

موسیٰ اقبال نے جہاں دار افسر کی حیات اور شخصیت کا نہایت تفصیل سے جائزہ لیا ہے انہوں نے اس خصوص میں جو چھان بین اور محنت کی ہے اس کی عکاسی جگہ جگہ ہوتی ہے سوانح اور شخصیت کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جہاں دار افسر کی شاعری، ان کی غزل، نظم، قطعات وغیرہ کا تجزیہ ہے۔ ان کی صحافتی زندگی کے لئے ایک باب مختص ہے۔ ان کی ادبی اور صحافتی زندگی کا تنقیدی تجزیہ، موسیٰ اقبال کی موضوع پر گرفت کی دلالت ہے۔ یہ کتاب

صرف اس لئے نہ پڑھیں کہ اس سے جہاں دار افسر کی شخصیت اور فن سے روشناس ہوں گے۔ بلکہ اس لئے کہ ایک انسان سے ملاقات ہوگی۔ عزم و ہمت اور حوصلہ ملے گا، توانائی ملے گی، روشنی ملے گی، آگے بڑھنے کا جذبہ ملے گا۔ خصوصاً نئی نسل کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس زاویہ سے کرنا چاہیے۔ موسیٰ اقبال کو اس پیاری کتاب کی اشاعت پر مبارکباد !

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
سابق صدر شعبہ اردو، سری وینکٹشورا یونیورسٹی
(تروپتی)

۲۷/اکتوبر/۲۰۰۱ء
اروناکالونی، ٹولی چوکی،
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۸۷

# شخص و عکس ۔ موسیٰ اقبال

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو لوگ محنتی ذہین اور مستقل مزاج ہوتے ہیں کامیابی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

فاضل مقالہ نگار عزیز القدر موسیٰ اقبال بھی ایسے ہی خوش نصیب افراد میں شامل ہیں۔

آج سے تقریباً پچیس سال پہلے انہوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وسطانی تعلیم کیلئے مشہور مدرسہ گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول، لاڈ بازار حیدرآباد میں داخلہ لیا اور اس کاروائی میں احقر نے مولوی امین الدین صاحب سے گفتگو کی چونکہ ان کے والد مستقر پر نہیں تھے اس لئے سرپرستی کیلئے احقر کا نام ہی پیش ہوا۔

نامساعد حالات کے باوجود موسیٰ اقبال نے بڑی ہمت اور خودداری سے اپنی تعلیم جاری رکھی اور سٹی ہائی اسکول لاڈ بازار سے ایس۔ایس۔سی کا امتحان امتیازی نشانات سے کامیاب کیا۔ اپنی ملنسار طبعیت اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے یہ اساتذہ کی توجہ کا مرکز بن گئے اور طلباء میں قائد کی حیثیت حاصل کرلی۔

ایس۔ایس۔سی کامیاب ہونے کے بعد انوار العلوم جونیر کالج، نامپلی میں داخل لیا اور اسی دوران کالج آف لینگوئجس سے گرائجویشن کی تیاری کی۔ اردو پنڈت کا امتحان پاس کیا اور فارمیسی میں بنگلور سے ڈپلوما بھی کیا۔ کالج آف لینگوئجس عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔اے۔ایل کیا اور اسکے بعد ایم۔اے بھی کیا۔

ان تمام مصروفیتوں کے باوجود موسیٰ اقبال نے ایک سچے اور مخلص خادم قوم کی حیثیت سے اور ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے اپنی خصوصی شناخت برقرار رکھی، قلیل المعاش اور کثیر المشاغل ہونے کے باوجود اپنی نجی اور ملی خدمات میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ مختلف ادبی انجمنوں اور سماجی تنظیموں سے وابستہ رہے۔ تحریری اور تقریری مقابلوں میں و نیز بیت بازی کے مقابلوں میں شرکت

کی اور ہر جگہ نمایاں کامیابی حاصل کی۔

دبستان فصاحت جنگ جلیلؔ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ادبی مقابلوں میں بارہا شریک ہوئے اور متعدد مرتبہ انعامات حاصل کیئے۔

کل ہند مجلس تعمیر ملت کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے تحریری اور تقریری مقابلوں میں شرکت کی اور ایک سے زائد مرتبہ انعام حاصل کیا۔

کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے قائد ملت نواب بہادر یار جنگ تقریری مقابلوں میں ہٹ ٹرک گولڈ مڈلس حاصل کیا۔

سابق گورنر آندھرا پردیش شریمتی کمود بین جوشی سے کئی ایک انعامات حاصل کیے، ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ نائب صدر نشین راجیہ سبھا سے بھی انعامات حاصل کیئے۔ ریاستی اسمبلی کے اسپیکر اور مئیر حیدر آباد و نیز ریاستی مرکزی وزراء سے بھی کئی بار انعامات حاصل کیے۔

ریڈیو، ٹی۔وی اور اسٹیج آرٹسٹ کی حیثیت سے بارہا مظاہرہ کر چکے ہیں اور اب انہوں نے جہاں دار افسرؔ حیات اور خدمات پر یم۔فل کا مقالہ تحریر کر کے عثمانیہ کے شعبہ اردو سے ماسٹر آف فلاسفی (یم۔فل) کی ڈگری حاصل کی ہے۔ محترم جہاں دار افسرؔ صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے ادبی اور علمی حلقوں میں بڑے احترام کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا ہے۔ان کی شخصت ہمہ گیر شخصیت ہے بیک وقت وہ مشہور کہنہ مشق شاعر بھی ہیں۔ ایک عظیم نقاد اور تجربہ کار صحافی ہیں کئی انجمنوں سے وابستہ اور ان کے روح رواں ہیں بڑے بے باک قائد اور سماجی رہنما بھی ہیں۔ انھوں نے حق گوئی سے بھی کبھی گریز یا چشم پوشی نہیں کی بلکہ بڑے سے بڑے جابر اور ظالم کے سامنے اظہار حق کیا اور اپنے فرض کو احسن طریقے پر نباہا یہ ہے یہ بڑی دلچسپ طبیعت کے حامل ہمدرد مخلص اور صاف گو مومن ہیں۔

حیدر آباد کی قدیم وضع دار شخصیت، ہمدرد قوم، راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے محترم جہاں دار افسرؔ کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ آج سے تقریباً چالیس برس پہلے انگارہ انگارے کے جوائینٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے جام باغ روڈ معظم جاہی مارکٹ کے پاس روز آنہ ہم مدرسہ کو آتے جاتے آپ کو

سلام کرتے ان دنوں ہم ابتدائی جماعتوں میں تھے، لیکن والد محترم شیخ محی الدین صاحب المعروف جلالی شاہ ہم سے کہا کرتے تھے کہ یہ محترم جہاں دار افسر ہیں بڑے صاف گو اور ہمدرد انسان ہیں ان الفاظ کا ہم کو اس زمانے میں ادراک نہیں تھا لیکن جیسے جیسے شعور بیدار ہوتا گیا۔ وہ الفاظ و مفہوم ہمارے سامنے آتا گیا میرے شاگردِ رشید موسیٰ اقبال کی یہ خوش بختی ہے بلکہ اقبال مندی ہے کہ اس نے ایک ایسی شخصت پر اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے جس کا ظاہر و باطن ایک ہے بلکہ باطن ظاہر سے زیادہ اجلا ہے۔ ایسی شخصیت برسوں میں پیدا ہوتی ہے۔ محترم کے صاحب زادے تجمل اظہر سے میری دوستی بہت قدیم ہے۔ ان کی زبانی ان کے والد کے کچھ حالات مزاج اور اولوالعزمی سے متعلق باتیں سننے کا موقع ملتا رہا۔

ان سے ایک دو بار ملاقات کا بھی موقع ملا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مقالہ اہل علم کیلئے ایک مشعل راہ ثابت ہوگا اور زندگی کے نشیب و فراز سے گذرتے وقت ان کے مضامین سنگ میل کی حیثیت رکھیں گے ادبی اور سماجی حلقوں کیلئے اکسیر و مجربات کی حیثیت رکھیں گے۔

فقط

شیخ کریم الدین عابد چشتی القادری

خانقاہِ کمالیہ، حیدر آباد۔

موسیٰ اقبال کو ایم۔ فل کی ڈگری ملنے پر اہلیان محلہ رنمست پورہ کی جانب سے تہنیتی تقریب منعقد کی گئی۔

اس موقع پر جناب دلاور علی حزیںؔ صاحب نے چند قطعات پیش کیے۔

یہ جہاں دار بھی ہیں ، افسؔر بھی
کام ان کا ہے رہبری کرنا
صاحب علم و فن کا مسلک ہے
ہر اندھیرے میں روشنی کرنا

☆ ☆ ☆

حضرتِ افسؔر یہ ایم فل آپ نے کیا کرلیا
آپ کا اقبال موسیٰ اور اونچا ہوگیا
علم کی دولت سے دیں سے سرفرازی مل گئی
آپ کے دل میں جو تھا منشاء وہ پورا ہوگیا

☆ ☆ ☆

قابلِ ذکر ان کی ہستی ہے
جن پہ یم۔ فل کیا ہے موسیٰ نے
علم کی روشنی میں آئے ہیں
کتنی محنت سے یہ خدا جانے

(سید دلاور علی حزیںؔ)

# جہاں دار افسؔر کی سوانح

صاحبزادہ میر جہاں دار علی خاں جو جہاں دار افسؔر کے قلمی نام سے مشہور اور پہچانے جاتے ہیں دکن کے آصف جاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔آپ کے اجداد (توران ترکستان) میں اپنے علم و فضل اور تقدس بزرگی کی وجہہ سے خاص شہرت کے مالک تھے۔آپ کا ددیالی سلسلہ نسب خلیفہ اوّل امیر المومنین حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے ہوتا ہوا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے آصف جاہ اول میر قمر الدین علی خاں تک پہنچتا ہے ۔جن کے پانچویں فرزند شہزادہ ہمایوں جاہ تھے۔ پرنس ہمایوں جاہ کے فرزند میر بہاء الدین علی خاں اُن کے فرزند میر اکبر علی خاں اُن کے فرزند میر منور علی خاں اُن کے فرزند افتخار علی خاں تھے۔میر افتخار علی خاں جہاں دار افسؔر کے والد تھے جو آصف جاہ اول بانی سلطنت آصفیہ کی ساتویں پشت میں ہیں۔اُن کا نہالی سلسلہ صمصام الدولہ سے ملتا ہے جو آصف جاہ ثالث نواب سکندر جاہ بہادر کے فرزند تھے۔جہاں درا افسؔر کی والدہ صاحبزادی رزاق النّساء بیگم نواب صمصام الدولہ کے فرزند نواب سہام جنگ ان کے فرزند میر دُرِ علی خاں اُن کے فرزند میر اقبال علی خاں کی واحد صاحبزادی تھیں۔اس طرح نہالی سلسلہ سے بھی جہاں دار افسؔر آصف جاہ اول کی ساتویں پشت سے ہیں اس طرح وہ نہالی اور ددیالی دوطرفہ صاحبزادہ ہیں۔جہاں دار افسؔر کی اہلیہ مرحومہ بھی اُن کی والدہ محترمہ کی طرح نواب صمصام الدولہ کی پوتی تھیں۔یہاں اس کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ نواب صمصام الدولہ نے بھی اپنے بھائی نواب مبارز الدولہ کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی تھی بھائی کے ساتھ کچھ عرصہ قلعہ گولکنڈہ میں قید رہے تھے۔ان دونوں کے ساتھ اُن کی والدہ فضیلت النساء بیگم (ملکہ وقت) کو بھی انگریزوں نے قلعہ میں قید کر رکھا تھا۔ آصف جاہی خاندان میں دو طرح کے ذہن تھے۔ایک حکمرانی سے دلچسپی رکھتا تھا اور دوسرا ذہن وطن کی محبت اور انگریز دشمنی سے مشہور تھا۔جہاں دار افسؔر، نواب ہمایوں جاہ، نواب مبارز الدولہ، نواب صمصام الدولہ، صاحبزادہ میر گوہر علی خاں اور صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ کی روایات کے پیرو کار

بنے اور ابتدائی عمر سے جاگیر شاہی اور سامراج دشمنی کے علمبردار بن کر ابھرے اور آج تک سی. پی. آئی. (کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا) کے رکن ہیں۔

جہاں دار افسرؔ نے بہت قریب سے آصف جاہی جلال بھی دیکھا اور زوال بھی۔ انھوں نے اپنی آنکھیں دیوڑھی کے امیرانہ ماحول میں کھولیں۔ ان کے اردگرد جاگیردارنہ اثرات تھے۔ اُن کے گھر میں بھی وہی تہذیب سانس لیتی تھی جو سرپرست خاندان اور حکمران وقت کی کنگ کوٹھی میں نظر آتی تھی صرفخاص مبارک سے خاندانی نسبت کے سبب اُن کے تمام بزرگ شاہ زیجاہ کی پیروی کو ضروری سمجھتے تھے۔

جہاں دار افسرؔ جس دیوڑھی میں رہتے تھے۔ وہ پہلے صرفخاص کی دیوڑھی تھی دیوڑھی کے ایک حصہ پر ایک تختی لگی رہتی تھی ''دیوڑھی صرفخاص مبارک و محلاتِ مبارک'' دیوڑھی کے دو جانب دو پہرے دار ہوا کرتے تھے۔ دونوں پہروں میں علاقہ صرفخاص اور نظم جمعت کے پہرے رہتے تھے۔ پہرے پر سپاہی آٹھ روز نشست اور آٹھ روز برخواست کے طور پر ڈیوٹی کرتے تھے۔ ایک سپاہی جس کا نام پربھو تھا وہ مشہور اُردو ناولیں اپنی ڈیوٹی کے دوران پڑھتا تھا۔ جہاں دار افسرؔ کی پہلی اُردو حرف شناسی اُسی سپاہی پربھو کی شفقت کا نتیجہ ہے۔

جہاں دار افسرؔ کے دادا صاحبزادہ میر منور علی خاں محبوب نگر کے کلکٹر (اول تعلقدار) تھے۔ اُن کے میڈل پاس کرنے پر نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس نے اُن کا راست تقرر تحصیلداری پر کیا تھا جہاں سے وہ ترقی کر کے اول تعلقداری تک پہونچے۔ اُن کے فرزند صاحبزادہ میر افتخار علی خاں جو جہاں دار افسرؔ کے والد تھے۔ لوکل فنڈ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ اُن کے شادی میر دُرِ علی خاں کی پوتی اور نواب اقبال علی خاں کی واحد صاحبزادی رزاق النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ میر افتخار علی خاں کا تبادلہ اورنگ آباد ہوا تو انھوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ صاحبزادہ میر افتخار علی خاں کو صاحبزادی رزاق النساء سے چار لڑکے میر جہاں دار علی خاں افسرؔ، میر ریاست علی خاں، میر فیاض علی خاں، میر طوفیق علی خاں، اور چار لڑکیاں فاطمہ احمد النساء بیگم، فاطمہ محمد النساء بیگم، فاطمہ روح النساء بیگم اور

ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ، نائب صدر نشین راجیہ سبھا، اردو گھر مغل پورہ میں مولانا ابوالکلام آزاد تقریری مقابلے
میں موسیٰ اقبال کو انعام اول دیتے ہوئے



گورنر آندھرا پردیش کمود بین جوشی سے ۲ر جنوری ۱۹۹۸ء کو پریس کلب حیدرآباد میں کل ہند تقریری مقابلے
میں موسیٰ اقبال انعام اول ۵۰۰ روپے نقد حاصل کرتے ہوئے۔



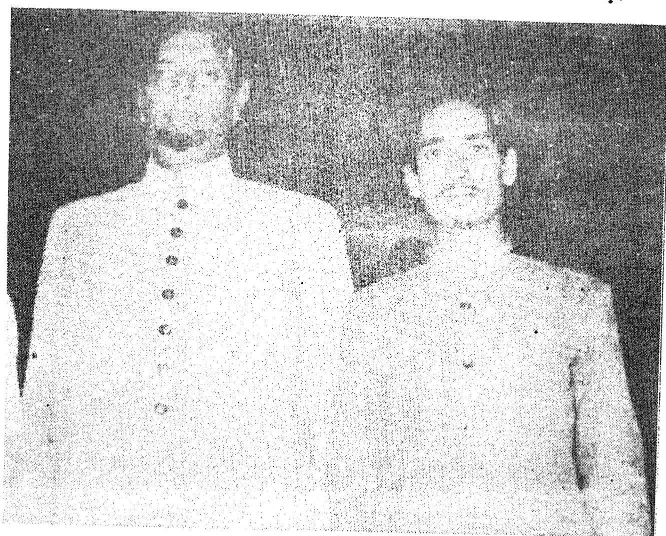
گورنر آندھرا پردیش کمود بین جوشی سے انا پورنا ہوٹل، نامپلی میں دوسری مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد تقریری مقابلے میں موسیٰ اقبال انعام اول حاصل کرتے ہوئے۔



ڈاکٹر گیتا ریڈی منسٹر حکومت آندھرا پردیش سے، مولانا ابوالکلام آزاد میموریل لائبریری میں موسیٰ اقبال تقریری مقابلے میں انعام اول حاصل کرتے ہوئے۔ نیوز ٹرسٹ آف انڈیا کے عارف الدین مرحوم بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔



کونسل جنرل ایران متعینہ حیدرآباد، میں منعقدہ تقریب میں جی۔ نارائین راؤ آڈوکیٹ اسپیکر اسمبلی
آندھرا پردیش سے تقریری مقابلے میں موسیٰ اقبال انعام اول حاصل کرتے ہوئے۔



موسیٰ اقبال، سلطان صلاح الدین اویسی (یم۔ پی) سے یوم قائد ملت نواب بہادر یار جنگ تقریری مقابلے
میں انعام اول قائد ملت گولڈ میڈل حاصل کرنے کے بعد



جناب ایم کے مبین میئر بلدعظیم تر شہر حیدر آباد کے ساتھ موسیٰ اقبال یوم سرسید کے موقع پر منعقدہ تقریری مقابلے میں انعام اول حاصل کرنے کے بعد۔



موسیٰ اقبال، دارالسلام میں جلسہ یوم قائد ملت کو مخاطب کرتے ہوئے، تصویر میں مولانا جلال الدین حسامی، مولانا باقر آغا، مولانا نصرت المجتہدی، ایم کے مبین (میئر حیدر آباد) دیکھے جاسکتے ہیں



موسیٰ اقبال شعبہ اردو آرٹس کالج میں منعقدہ تہنیتی تقریب کے موقع پر پروفیسر افضل الدین اقبال چیرمین بورڈ آف
اسٹڈیز کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے، تصویر میں ڈاکٹر عقیل ہاشمی، پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ،
پروفیسر بیگ احساس صدر شعبہ اردو دیکھے جاسکتے ہیں

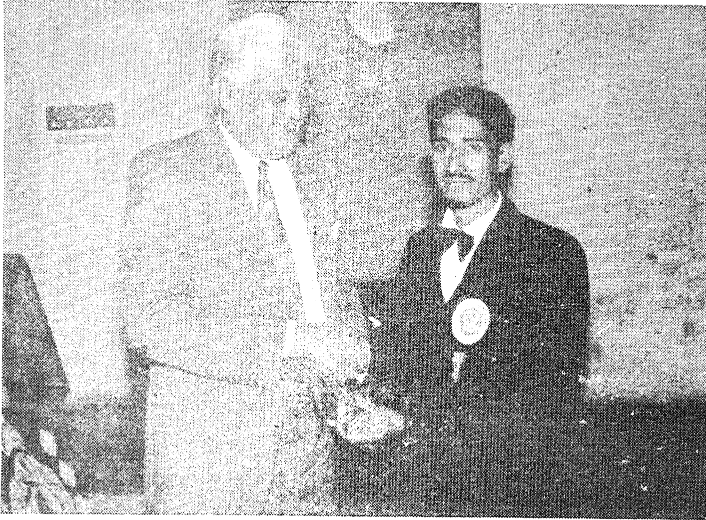


قلعہ گولکنڈہ سیرت کمیٹی کی جانب سے منعقدہ تقریری مقابلے میں موسیٰ اقبال، ایڈیٹر روزنامہ منصف جناب محمود انصاری سے
انعام اول حاصل کرتے ہوئے محترم سید شاہ آعظم علی صوفی صاحب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

یوم رحمت للعلمین ﷺ کے ضمن میں منعقدہ تقریری مقابلے میں موسیٰ اقبال انور العلوم جونیر کالج، نامپلی کی نمائندگی کرتے ہوئے، جناب سلیمان سکندر صاحب نائب صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت سے انعام اول حاصل کرتے ہوئے



موسیٰ اقبال، جناب نواب شاہ عالم خاں، جناب سلیمان سکندر صاحب کے درمیان دیکھے جاسکتے ہیں



جسٹس سردار علی خان چیرمین مرکزی اقلیتی کمیشن کے ہاتھوں اردو فیسٹیول عثمانیہ یونیورسٹی میں موسیٰ اقبال کنوینر
تقریری مقابلے کے حیثیت سے انعام حاصل کرتے ہوئے۔



ڈراما ''محمد قلی'' میں موسیٰ اقبال اور ڈاکٹر تاتار خاں اور ڈرامہ کے دیگر فنکار

انوار العلوم جونیر کالج نامپلی کے سالانہ جلسہ میں نواب شاہ عالم خان صدر نشین انوار العلوم ایجوکیشن سوسائٹی کے ہاتھوں موسیٰ اقبال تقریری مقابلے میں انعام اول حاصل کرتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔

موسیٰ اقبال، دربار حسینی میں تقریری مقابلے میں حصہ لیتے ہوئے۔ تصویر میں سید غوث خاموشی صاحب دیکھے جاسکتے ہیں



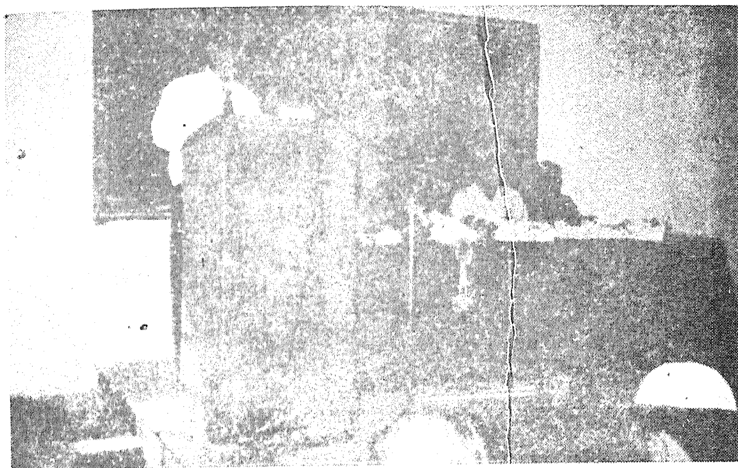
موسیٰ اقبال، بین الاقوامی شہرت یافتہ افسانہ نگار محترمہ جیلانی بانو سے دبستان فصاحت جنگ جلیل کے زیر اہتمام منعقدہ تقریری مقابلے میں انعام اول حاصل کرتے ہوئے، پروفیسر ڈاکٹر حبیب ضیا بھی دیکھیں جاسکتی ہیں



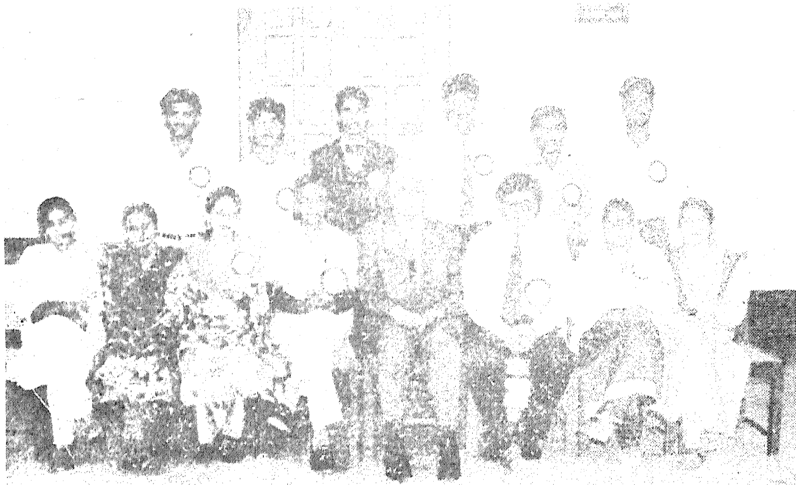
موسیٰ اقبال، یوم قائد ملت کے موقع پر حضرت مولانا جلال الدین حسامی سے انعام اول قائد ملت گولڈ میڈل حاصل کرتے ہوئے تصویر میں سلطان صلاح الدین اویسی (یم۔ پی) بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔



موسیٰ اقبال، گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول لارڈ بازار کے سالانہ جلسے کو مخاطب کرتے ہوئے، تصویر میں ہیڈ ماسٹر جناب پی۔ لکشمن راو اور جناب محمود قدرتی صاحب اور دیگر مہمانِ خصوصی بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔



ڈاکٹر بیگ احساس کے بحیثیت صدر شعبۂ اردو کے تقرر پر موسیٰ اقبال، عثمانیہ یونیورسٹی میں منعقدہ تہنیتی تقریب کو مخاطب کرتے ہوئے (تصویر میں دائیں سے پروفیسر غیاث متین، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر اشرف رفیع صاحبہ، ڈاکٹر عقیل ہاشمی، پروفیسر افضل الدین اقبال، چیرمین بورڈ آف اسٹڈیز دیکھے جاسکتے ہیں۔



جسٹس سردار علی خاں، پروفیسر غیاث متین، پروفیسر بیگ احساس صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، موسیٰ اقبال اور دیگر طلباء و طالبات کے ساتھ دیکھے جاسکتے ہیں

فاطمہ کاظم النساء بیگمؔ تولد ہوئیں۔ جہاں دار افسرؔ کے تینوں بھائیوں اور چاروں بہنوں کا انتقال ہو چکا ہے۔

پیدائش: جہاں دار افسرؔ ۱۵/ مئی ۱۹۲۵ء مطابق ۲۱/ شوال ۱۳۴۳ھ کو وکٹوریہ میٹرنٹی ہوم (افضل گنج) میں پیدا ہوئے۔ اُن کی پیدائش پر حکمران وقت نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع خود بہ نفس نفیس دواخانہ تشریف لائے تھے۔ نومولود کی پیشانی پر کچھ اُبھار تھا۔ آصف جاہ سابع حکمت سے بھی واقف تھے۔ اُنھوں نے مشورہ دیا کہ لڑکے کو تاج پہنایا جائے۔ اس حکم پر عمل کیا گیا اور کچھ ہی عرصہ میں پیشانی کا وہ اُبھار غائب ہو گیا۔

تعلیم و تربیت : جہاں دار افسرؔ کی تعلیم و تربیت حیدآباد میں ہوئی۔ دس سال کی عمر میں انھوں نے قرآن مجید ختم کیا اور اس کا ایک دور بھی مکمل کیا۔ قرآن مجید کا ختم مولانا شیخ احمد العمودی کے ہاتھ پر ہوا۔ اس موقعہ پر حیدرآباد کے ایک بزرگ شاعر ہرمزؔ حیدآبادی نے دو قطعات کہے تھے۔

پہلا قطعہ

بھیجا جو کلام اپنا خدائے ازلی نے
ختم اس کو کیا میر جہاں دار علی نے
ہرمزؔ کو یقیں ہے کہ یہ ہو عالم و فاضل
جب دی ہے مدد حق نبی اور ولی نے

دوسرا قطعہ

جہاں دار آپ نے اس کمسنی میں پڑھکر قرآں کو
کیا پھر دور بھی حیرت ہے جس سے دورِ دوراں کو
رہے تعلیم دیں حق سے تیرا خاندان روشن
ضیائے شمس بخشے نور جب تک ماہ تاباں کو

جہاں دار افسرؔ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اعزاء ملک پیٹ میں ہوئی۔ اس مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر انگریز ہوتے تھے۔ یہ مدرسہ اپنے زمانے کے بہترین مدرسوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لڑکوں نے اپنی محنت لگن اور جستجو سے مدرسہ کا نام روشن کیا اور ساتھ ہی اپنے ملک کے کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ اس مدرسہ میں داخلہ آصف جاہی خاندان کے طالب علم کی حیثیت سے بہ ذریعہ فرمان ہوتا تھا۔ جب جہاں دار افسرؔ مدرسہ اعزاء کی جماعت سوم میں تھے ان کا انتخاب سر شہزادہ اسکالرشپ کے لئے ناظم تعلیمات اور معتمد تعلیمات نے کیا۔ مدرسہ اعزاء میں ۱۹۳۰ء تک زیر تعلیم رہے۔ اس زمانے میں دینیات کی تعلیم لازمی تھی اس مضمون میں اوّل آنے پر انھیں گولڈ مڈل بھی ملا تھا۔ پھر مدرسہ اعزاء کے بعد ان کی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی اسکالرشپ حاصل کرنے والوں کو ذریعہ فرمان مدرسہ عالیہ اور عالیہ بورڈینگ ہاؤس میں راست داخلہ ملتا تھا۔ مدرسہ عالیہ میں میٹرک تک یوروپین لیڈی ٹیچرس تعلیم دیتے تھے۔ مدرسہ عالیہ میں ۱۹۳۴ء تک زیر تعلیم رہے۔

## جہاں دار افسرؔ نظام کالج میں :

جہاں دار افسرؔ مدرسہ عالیہ سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد نظام کالج میں شریک ہوئے۔ اس زمانہ میں نظام کالج کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے تھا۔ جہاں دار افسرؔ نے نظام کالج میں انٹر تک تعلیم حاصل کی۔ مدرسہ عالیہ اور نظام کالج میں ان کا ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ اس طرح نظام کالج سے جہاں دار افسرؔ ۱۹۴۵ء تک وابستہ رہے۔

### مدرسہ اعزاء اور مدرسہ عالیہ کے وہ اساتذہ جن سے جہاں دار افسرؔ متاثر ہوئے :

جہاں دار افسرؔ مدرسہ اعزاء اور مدرسہ عالیہ کے حسب ذیل اساتذہ سے متاثر ہوئے۔ علامہ غلام نبی نظمیؔ، مولوی میر آفتاب علی خاں مہرؔ (شاگرد حضرت داغؔ دہلوی)، بھاسکر نارائن، پروفیسر پرسادراؤ، شیخ علی العودی، کیپٹن میر نجابت علی خاں، میر اشرف علی خاں یم۔اے (عثمانیہ)

**لیڈی ٹیچرس میں جن سے جہاں دار افسرؔ متاثر ہوئے ان میں :-** مسرس اولیری،

مس اڈویڈ، مس ٹائٹل، مسز روزینہ، مس ڈورانندی اور مس ڈریک قابل ذکر ہیں۔ مدرسہ عالیہ اور نظام کالج کے پرنسپل مسٹر ولیم ٹرنر جہاں دار افسر کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ اس زمانہ میں شاگرد بھی اپنے اُستادوں کا اپنی ماں باپ کی طرح احترام کیا کرتے تھے۔ جہاں دار افسر سٹی کالج اور ال سینٹس میں بھی کچھ عرصہ تعلیم پائی۔

**شادی** :۔ جہاں دار افسر کی شادی ان کی ننھیالی عزیزہ صاحبزادی حُسن آراء بیگم سے طالب علمی کے زمانہ میں ہوئی شادی کے بعد بھی تعلیمی سلسلہ جاری رہا وہ عالیہ بورڈنگ ہاؤس سے جمعرات کے روز گھر آتے اور ہفتہ کی صبح بورڈنگ واپس ہو جاتے۔ کیونکہ اس زمانے میں جمعہ کو ہفتہ واری تعطیل ہوا کرتی تھی۔ جہاں دار افسر کو صاحبزادی حُسن آراء بیگم کے بطن سے تین لڑکے اور چار لڑکیاں تولد ہوئے۔ بڑے جواں سال فرزند میر احتشام علی خاں اکبر شاہ کا دوبئی میں ایک ٹرافک حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ اب دو لڑکے میر تجمل علی خاں اطہر اور میر امتیاز علی خاں اصغر بقید حیات اور صاحب اولاد ہیں ۔سب لڑکیوں کی بھی شادیاں ہو چکی ہیں۔

**صاحبزادیاں** :۔ صاحبزادہ جہاں دار افسر کی چار لڑکیوں کے نام یہ ہیں۔ فاطمہ تہذیب النساء بیگم، فاطمہ تنویر النساء بیگم، فاطمہ تہنیت النساء بیگم اور، فاطمہ تمکنت النساء بیگم یہ سب لڑکیاں صاحب اولاد ہیں۔

**جہاں دار افسر کے پوتے** : ۔ جہاں دار افسر کو اس وقت چار پوتے ہیں جن کے نام میر واثق علی خاں، میر تفضّل علی خاں، میر عابد علی خاں، میر سرفراز علی خاں ہیں۔

**پوتیاں** : جہاں دار افسر کو چار پوتیاں ہیں ان کے نام ہیں واثیف النساء بیگم عرف (قدسیہ) فاطمہ اشرف النساء بیگم (آسیہ) فاطمہ زیب النساء بیگم (مہ جبیں) فاطمہ حُسن آراء بیگم (فرحین)

**نواسے** : جہاں دار افسر کے اس وقت آٹھ نواسے گیارہ نواسیاں ہیں۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں میر ناصر علی خاں، میر باسط علی خاں، میر شاہد علی خاں، سید اعزاز محمد علی خاں، سید ارشد محمد، سید ابرار محمد، میر

قمرالدین علی خاں، میر یاور علی خاں۔

**نواسیاں:** حمیرہ، عرشیہ، اصفیہ، عائشہ، عاطفہ، حفصہ ہاجرہ، فاطمہ عظمہ، سیدہ سعدیہ، زینب، مسرت، روبینہ، صاحبزادہ جہاں دار افسؔر کو پڑنواسے اور پڑنواسیاں بھی ہیں۔

**شاعری کی ابتداء ۱۹۴۰ء سے:**۔یوں تو جہاں دار افسؔر کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ چنانچہ مدرسہ عالیہ میں اُس وقت کے اساتذہ علامہ غلام نبی نقظیؔ، آفتاب علی خاں مہرؔ احمد حسین خاں، اور میر اشرف الدین علی خاں یم.اے (عثمانیہ) کی وجہ سے اسکول اور بورڈ ینگ میں بڑا علمی اور شعری ماحول رہتا تھا۔ اس زمانے میں ایک قلمی رسالہ الآصف کے نام سے بوڈرس نکالا کرتے تھے۔ چنانچہ اس قلمی ماہ نامہ میں شریک ہونے کے لئے سب کے مضامین اور تخلیقات کے ساتھ جہاں دار افسؔر بھی اپنی تخلیق کی طرف بھی توجہ کی اور علی نقی خاں ساغؔر بورڈ ینگ کے ایک سینئر طالب علم تھے۔ انھیں سے ابتدائی اصلاح لی گئی اس کے بعد اس زمانے کے مشہور شاعر حضرت محمد علی شیدا سے مشورہ سخن ہونے لگا ایک مرتبہ جب سالار جنگ حال میں حسرؔت موہانی کی صدارت میں آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا تھا تو اس مشاعرے میں مدرسے عالیہ کے طلبا کی نمائندگی کرتے ہوئے جہاں دار افسؔر نے پہلی بار اپنا کلام سنایا۔ اور حضرت جگر مراد آبادی سے اس شعر پر۔

شبِ فرقت سحر تک میں بھی رویا شمع بھی روئی
مرے مانند وہ بھی دل جلی معلوم ہوتی ہے

بے پناہ داد حاصل کی اس مشاعرہ میں حضرت صفؔی اورنگ آبادی بھی موجود تھے۔ مشاعرے کے دوسرے دن اردو اخبارات نے جہاں دار افسؔر کے کلام کو طلبا شعراء میں حاصل مشاعرہ قرار دیا گیا۔

**تلامذہ حضرت صفؔی:** حضرت صفؔی آورنگ آبادی جہاں دار افسؔر کے گھر پہنچے اور اُن کے والدِ محترم میر افتخار علی خاں کو مبارک باد دی اور کہا کہ آپ کے فرزند کو میرے پاس بھیجیں چنانچہ چار روز بعد جہاں دار افسؔر بورڈ ینگ سے واپس آئے تو اِن کو پیام ملا۔ جہاں دار افسؔر بڑی عقیدت اور ارادت کے ساتھ حضرت صفؔی اورنگ آبادی کی قیام گاہ پہنچے صفؔی اورنگ آبادی نے بڑی حوصلہ افضائی کی اور ان کو آتے جاتے رہنے کی ہدایت دی اور وہ حضرت صفؔی کی بات چیت سے اتنا متاثر ہوئے کہ اُن کے

حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے اور حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کی آخری سانس تک اُن سے اپنے کلام پر اصلاح کا شرف حاصل کرتے رہے۔

## حضرت صفیؔ صاحب کی اصلاح کا طریقہ :

جہاں دار افسرؔ ہم محلہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف صفیؔ صاحب بلکہ اُن کی والدہ محترمہ جنھیں سب حضرت اماں کہتے تھے۔ جہاں دار افسرؔ سے بڑا مشفقانہ سلوک کرتی تھیں۔ حضرت صفیؔ صاحب کا حکم یہ تھا کہ ایک نوٹ بک لائی جائے اُسکے ایک صفحہ کو دو حصوں میں بانٹا جائے ایک حصہ پر غزل یا نظم لکھی جائے دوسرا حصہ اصلاح کیلئے سادہ چھوڑ دیا جائے صفیؔ کی قیام گاہ پر آنے کے آداب و اوقات مقرر تھے۔ حکم تھا کہ دستک دھیمی انداز میں دی جائے کوئی شاگرد زور سے تالی بجاتا تو وہ دیوان خانہ کا دروازہ کھول کر چلمن سے کہتے کہ میاں میں آپ کا کوئی قرض باقی نہیں ہوں۔ یہ اتنی زوردار دستک اور زوردار آواز کی کیا ضرورت ہے۔ میں ایک غریب اور مفلس شاعر ہو۔ اڑوس پڑوس آپ کی آواز سے کہیں یہ نہ سمجھ لے کہ کوئی قرض وصول کرنے آیا ہے۔ دیوان خانہ میں داخل ہونے کے بعد حکم تھا کہ دونوں جوتے طریقے سے اور سلیقے سے اس طرح رکھے جائیں کے واپسی میں جوتا اُلٹنے کی ضرورت نہ پڑے کوئی شاگرد بے ترتیب جوتے رکھتا تو حضرت صفیؔ کہتے کہ میاں آپ کو جوتے ترتیب سے رکھنا نہیں آتا۔ آپ شعر کیا سلیقے اور طریقے سے کہہ سکیں گے۔

## رومانی اشعار پر حضرت صفیؔ کا حکم :

حضرت صفیؔ کی دیوان خانہ کا عقبی دروازہ حضرت کے دالان میں کھلتا۔ جہاں حضرت امّاں آرام فرماتی تھیں۔ شاگردوں کو حکم تھا کہ عشقیہ اور رومانی شعر دھیمی آواز میں سُنائے جائیں۔ کوئی شاگرد باآواز بلند رومانی شعر سُناتا تو حضرت فرماتے اگر حضرت اماں تک یہ آواز چلی جائے تو میرا گھر میں رہنا مشکل ہو جائے۔ حضرت اماں صفیؔ کی علّاتی والدہ تھی۔ مگر وہ ان کا ایسا احترام کرتے تھے۔ کہ آج کوئی اپنی حقیقی ماں کا بھی ویسا احترام نہیں کرتا۔ صفیؔ صاحب کا ایک حکم یہ بھی تھا کہ اگر کسی مشاعرہ میں

جائے تو شاگرد دوسرے دن آکر مشاعرہ کی روداد سنائیں۔

## حضرت صفیؔ آگ بگولہ ہوگئے:

جہاں دار افسرؔ چونکہ نومشق اور ناتجربہ کار تھے۔ایک بار انھوں نے مشاعرے کی روداد سُناتے ہوئے۔ایک اُستاد شاعر کے کلام پر اپنی کچھ تنقیدی رائے دے دی۔حضرت صفیؔ فوراً آگ بگولہ ہوگئے۔حکم ہوا کہ آپ فوری دیوان خانہ سے نکل جائیں۔کیونکہ آج آپ ہمارے ایک ہم پلہ شاعر پر تنقید کر رہے ہیں کل ہم بھی آپ کی لپیٹ میں آسکتے ہیں۔چنانچہ جہاں دار افسر نے اِس گستاخانہ حرکت پر ندامت کا اظہار کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ احتیاط ملحوظ رکھی جائیگی۔بڑی معذرت خواہی کے بعد حضرت کا غصہ دور ہوا حضرت صفیؔ نے کہا تھا مجھے آپ جیسے شاگردوں کی ضرورت نہیں کیونکہ جو اُستادوں پر تنقید کرتے ہیں۔وہ شاگرد اُستاد نہیں بن سکتے۔مگر آج کل کا مزاج یہ ہے کہ ایک اُستاد دوسرے اُستادانِ سُخن کے خلاف اپنے شاگردوں کو اُکساتے ہیں۔

## جہاں دار افسرؔ کے انقلابی تحریک میں آنے کی وجوہات:

مدرسہ عالیہ و نظام کالج کا ماحول جمہوری اور سیکولر تھا۔پھر میر حسن یم۔اے (عثمانیہ) کے توسط سے جب مخدومؔ محی الدین سے قربت بڑی تو ذہن نظام شاہی کے خلاف اور جاگیر شاہی کے خلاف ہوگیا۔چنانچہ ۱۹۴۵ء میں جہاں دار افسرؔ اور صاحبزادہ محمد علی خان میکشؔ دونوں کنگ کوٹھی میں گھس کر نظام شاہی کے خلاف نعرے لگائے اور جمہوریت کا مطالبہ کیا دونوں حکمران وقت کے معتوب ہوئے والد محترم میر افتخار علی خاں اور خسر محترم میر کفایت علی خاں سے نظام سابع کے شخصی مراسم تھے۔بازپُرس ہوئی۔ان دونوں نے مکمل بے تعلقی کا اظہار کردیا۔حکمران وقت نے اپنی دانش وفراست سے کام لیتے ہوئے پولیس کی کسی کاروائی یا جیل بھیجنے کے بجائے دیوڑھی کو واپس کردیا۔محلات پولیس اور سٹی پولیس کو حکم ہوا کہ یہ واقعہ ریکارڈ نہ کیا جائے۔اس طرح وہ انقلابی کہلائے۔اور بعد میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبر رہے۔اور دو میقات تک کمیونسٹ کونسلر کی حیثیت سے مغلپورہ مونسپل کونسلر ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۴ء

رہے۔ پولیس ایکشن سے پہلے کارکن صحافیوں کے روٹی روزگار کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ آزادی ہند کے بعد اور پولیس ایکشن کے بعد پارلیمنٹ سے ورکنگ ایکٹ منظور ہوا اور تنخواہ بورڈس pay (Board) بیٹھائے گئے۔ روزنامہ سیاست کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اُس نے ان قوانین پر فوری عمل کیا۔

## انقلابی مجاہدین سے جہاں دارافسر کے روابط

ا۔ مخدوم محی الدین: جہاں دارافسر ممتاز انقلابی مجاہد مخدوم محی الدین کو عالیہ بورڈ ینگ ہاوس میں اور اکثر جان کمپنی کے پاس گرامر اسکول کے قریب فٹ پاتھ پر اپنے احباب کے ساتھ کھڑا ہوا دیکھتے تھے۔ اُس زمانے میں مخدوم اور میر حسن یم.اے (عثمانیہ) کی شناخت یہ تھی کہ وہ بہت بڑے اور بے ترتیب بال رکھتے تھے۔ میر صاحب کے جسم پر ایک سیاہ شیروانی اور وہ بھی میلی کچیلی نظر آتی اور مخدوم محی الدین ایک ملگجا سفید پتلون اور میلا کچلا سیاہ کورٹ پہنے دکھائی دیتے تھے۔ بعد میں جب میر حسن صاحب کو مدرسہ عالیہ میں ٹیچر کی ملازمت ملی تو اُنھیں عالیہ بورڈ ینگ ہاوس کا ہاوس ماسٹر بھی بنایا گیا۔ اور نظام کالج کے پرنسپل ولیم ٹرنر نے اُنھیں پابند کیا کہ وہ اپنے بال ترشوائیں اور ہر روز بورڈ ینگ میں غسل کریں اس طرح مخدوم صاحب سٹی کالج میں ٹیچر ہوئے تو اُن کی زندگی میں بھی لباس اور وضع قطع میں تبدیلی آئی۔ مخدوم محی الدین لطیفہ گوئی کے ماہر تھے۔ بات میں بات پیدا کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ وہ ہمہ وقتی طور پر شعر نہیں کہا کرتے تھے ان میں شعر گوئی کا مزاج اکثر سفر کے دوران پیدا ہوتا تھا ان کی تقاریر میں آشفتہ سری کے ساتھ آداب بھی ملحوظ رہتا تھا۔ مخدوم صاحب کو بحثیت شاعر بحثیت مقرر اور بحثیت دوست جہاں دارافسر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ بچوں میں بچے تھے اور عورتوں میں ایسے گھل مل جاتے تھے۔ کہ بگھارے بیگن کے پکوان سے لیکر (پان) بلوری کے طور طریقوں پر بھی ماہرانہ بات چیت کرتے تھے۔ غرض مخدوم محی الدین دانشوروں کیلئے ایک کتب خانہ تھے۔ اور انقلابیوں کیلئے ایک اسلحہ خانہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ دانشوروں کے دانشور اور مفکرین کے لئے مفکر تھے۔ مخدوم انتہائی سنجیدہ سیاسی میٹنگ میں ورکرس سے خطاب کے دوران

جب کسی اچھے گانے کی آواز آتی تو کہتے کے قریب سے کسی اچھے گانے کی آواز آرہی ہے۔ اِسے تین منٹ کا وقفہ دیا جاتا ہے اور وہ گانے کے دوران گم سم ہو جاتے۔

۲. راج بہادر گوڑ : ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، مخدوم محی الدین کے انتہائی قریبی رفیق تھے۔ وہ مخدوم کے رزم و بزم کے ساتھی رہے۔ مخدوم شناسی میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نامور اور قد آور انقلابی ہونے کے باوجود اُن کی مزاج میں چلبلہ پن ہے۔ ایک بار ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے ڈاکٹر زینت ساجدہ سے پوچھا کہ میں تم سے اور تم مجھ سے بے حد مخلصانہ جذبہ رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دوستی صفتِ مشترک ہے آخر تم میں اور مجھ میں کون سی صفت مشترک ہے تو ڈاکٹر زینت ساجدہ نے برجستہ کہا تھا کہ چھچھورا پن۔ اسی زندہ دلی کی بنا پر وہ زندہ دلان حیدرآباد کے صدر بھی ہیں۔ سی۔ پی۔ آئی میں آج ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی طرح بہت کم لیڈر رہ گئے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑ کے پاس جہاں دار افسر کو ایک صبح ایک خاتون کے ساتھ اُن کی سفارش کیلئے جانا پڑا خاتون کے شوہر بھی اُن کے ساتھ تھے۔ جب وہ سب ڈاکٹر گوڑ کی قیام گاہ پہنچے تو وہ آرام کر رہے تھے۔ برج رانی گوڑ نے انھیں جگایا ڈاکٹر گوڑ بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے کہ پرانے شہر کہ لوگ بھی کیا علی الصبح اُٹھ جاتے ہیں۔ اور وہ جہاں دار افسر سے ان کے آنے کی وجہہ دریافت کی تو اُنھوں نے خاتون سے متعلق ایک اعلیٰ عہددار کے نام خط کی سفارش کی وہ لیٹر پیاڈ لیکر عہدار کا نام لکھنے لگے پھر سلام و دعا لکھا۔ پھر اچانک رک گئے جہاں دار افسر نے سمجھا کے وہ شاید خاتون کا نام بھول گئے ہیں۔ انھوں نے خاتون کا نام دھرایا تو انھوں نے کہا نام جو تم نے کہا ہے وہ مجھے یاد ہے مگر میں اس فکر میں مبتلا ہوں کہ خاتون کو حاملِ ہذا لکھوں یا حاملہِ ہذا لکھوں یہ سن کر جہاں دار افسر اور اس خاتون کے شوہر ہنس پڑھے کیوں کہ ان دنوں وہ خاتون حاملہ تھیں۔

۳. روی نارئن ریڈی : تلنگانہ مسلح جدو جہد کہ روی نارائن ریڈی اور بدم یلا ریڈی بڑے لیڈر تھے۔ روی نارائن ریڈی کسانوں میں اتنے مقبول تھے کہ ۱۹۵۲ء کے پہلے لوک سبھا الیکشن میں انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ ووٹ حاصل کئے۔ ملک بھر میں انھیں یہ اعزاز حاصل تھا کے سب

سے زیادہ ووٹ ان کے حصہ میں آئے ہیں۔ وہ تلگو کے ساتھ اُردو بھی روانی سے بولتے تھے۔ روی نارائن ریڈی کے ساتھ پدامنگال (ضلع نلگنڈہ) حلقہ میں انتخابی کام کرنے کا جہاں دار افسرؔ کو موقع ملا پارٹی کارکنوں کی وہ اپنی آنکھ کی پتلی کی طرح حفاظت کرتے تھے۔ جب کبھی جہاں دار افسرؔ سے ان کی ملاقات ہوتی تو وہ پوچھتے کہیے والا جناب کام کیسے چل رہا ہے۔ ان کے افراد خاندان بھی جہاں دار افسرؔ کو اپنے فرد خاندان کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ ایک بار ناگر جنا ساگر سے سری سیلم مندر تک کشتی میں سفر کے دوران مسز روی نارائن ریڈی اور ان کی صاحبزادی جہاں دار افسرؔ کے ہم سفر رہے۔ سفر کے دوران مسز نارائن ریڈی نے جہاں دار افسرؔ سے اپنے فرد خاندان اور بچوں جیسا سلوک کیا۔ جہاں دار افسرؔ کی روی نارائن ریڈی سے پارٹی آفس اور درمیان میں بھی سدا ملاقاتیں ہوتی رہیں آخری ملاقات حمایت نگر میں لبرٹی روڈ کے پاس ان کی قیام گاہ پر ہوئی پارٹی امور پر بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ ہم ضعیف ہو چکے ہیں۔ اب یہ نوجوانوں کی ذمہ داری ہے کہ انقلابی فکر و عمل کو آگے بڑھائیں بدم یلا ریڈی سرسیلہ کے رہنے والے تھے ان کے ساتھ جہاں دار افسرؔ کو جیل میں ڈیڑھ ماہ تک ساتھ رہنے کا موقع ملا وہ جیل میں اپنے ساتھیوں سے ایسی اُردو میں بات چیت کرتے تھے جسے کتابی یا دفتری زبان کہا جا سکتا ہے۔

## جہاں دار افسرؔ کی اُردو تحریک سے وابستگی:

پولیس ایکشن کے بعد انجمن ترقی اُردو کے قائدین ترک وطن کر کے جا چکے تھے اُردو کا نام لینا جرم قرار دیا جاتا تھا۔ کیونکہ بابائے قوم مولوی عبدالحق پاکستان منتقل ہو گئے تھے۔ اس لئے کانگریس کے اندر اور باہر کی فرقہ پرست طاقتیں اُردو کو تقسیم ہند کا مجرم قرار دے رہے تھے۔ ایسے میں عثمانیہ یونیوسٹی کے پروفیسر معاشیات و سابق معتمد صنعت و حرفت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے انجمن کی احیاء کی کوشش شروع کی ان کوششوں کا جب چرچا ہوا تو حبیب الرحمٰن صاحب کو دور اور نزدیک کے ہمدردوں نے انھیں نجی ملاقاتوں اور خطوط و پیامات کے ذریعے مشورہ دیا کے وہ اُردو کو بھول جائیں ورنہ

پولیس ایکشن کے بعد اقلیتوں اور جمہوری حقوق کے پاسبانوں سے جو سلوک ہو رہا ہے اس سے وہ محفوظ نہ رہ سکیں گے کیونکہ اس زمانے میں نیک اطوار اور کردار کے بااول تعلقدار (کلکٹر) اور صوبیدار بھی نت نئے الزامات کے تحت دار و رسن کی آزمائشوں میں مبتلا کئے جا رہے تھے۔ صدر ناظم کوتوالی کو تک برف کی سلوں پر لٹا کر تفتیش کی جا رہی تھی۔ مشہور صنعت کار احمد علاؤ الدین کو بھی طرح طرح کی تکلیفیں اذیتیں دی جا رہی تھیں ایسے میں نتائج و عواقب کی پرواہ کیے بغیر مولوی حبیب الرحمٰن نے اُردو کے پرچم کو بلند رکھنے کا تہیہ کیا۔ مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ، عابد علی خاں اور پروفیسر ہارون خاں شیروانی ان صبر آزما حالات میں حبیب الرحمٰن صاحب کی ہمت باندھاتے رہے۔ اس زمانے میں جن نوجوانوں نے حبیب الرحمٰن صاحب کا ساتھ دیا ان میں ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر زینت ساجدہ، سری نواس لاہوٹی، شریف اسلم (جدہ) وہاب حیدر، احسن علی مرزا، منظور احمد منظور، جہاں دار افسر، امجد باغی، راگھو بنسی نرمل، برق یوسفی، اختر حسن، سلیمان اریب اور بے شمار ادیب شاعر اور دانشور رفتہ رفتہ میدان عمل میں آنے لگے۔ حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنی حمایت نگر کی پوری جائیداد اُردو ہال، اُردو آرٹس کالج اور اورینٹل اُردو کالج کے لئے وقف کر دی۔ آج اس جائیداد کی لاگت کروڑہا روپیئے کی ہے۔ ایک ایسے ماحول میں جب کے چھوٹی سی جائیداد کے لئے خون خرابے ہو جاتے ہیں کروڑہا روپیوں کی جائیداد وقف کر دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ حبیب الرحمٰن صاحب کوئی لاوارث نہیں تھے ان کے ایک صاحبزادہ اور ایک صاحبزادی بھی تھے۔ مگر انھوں نے اپنی ساری جائیداد کو اُردو کیلئے وقف کر کے ایثار و قربانی کی ایک لازوال مثال پیش کی حبیب الرحمٰن صاحب ہمیشہ سے اُردو کے کارکنوں کو یہی کہتے تھے کہ ''کام کو کام کا انعام سمجھو'' وہ یہ بھی کہتے تھے کے اُردو کا کام کرنے والوں کو تالی کم اور گالی زیادہ ملتی ہے۔ حبیب الرحمٰن صاحب کی ان صحبتوں کے اسی فیض نے اس دور کے بے شمار نوجوانوں کو ایثار کا پیکر بنایا اس طرح حبیب الرحمٰن صاحب نے اُردو کے جمہوری تحریک ہی کو کھڑا نہیں کیا صرف اُردو ہال، اُردو آرٹس کالج اُردو اورینٹل کالج ہی نہیں بنایا بلکہ نوجوانوں کو اُردو کاز کے لئے بڑی تعداد میں تیار کیا۔ چنانچہ جہاں دار افسر بھی دوسروں کے ساتھ

روز اول سے مولوی حبیب الرحمٰن کی اُردو تحریک کے ساتھ رہے۔ ہر سرد وگرم کا مقابلہ کیا اور آج بھی انجمن ترقی اُردو شہر حیدر آباد کے نائب صدر ہیں حبیب الرحمٰن صاحب کے زمانے سے آج تک جتنے آل انڈیا یا ریاستی اُردو کنونشن ہوئے ان میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انجمن کی ہر سالانہ کانفرنس میں اب تک شریک ہوتے رہے۔

ریاست حیدر آباد میں جب بی رام کشن راؤ کی حکومت تھی۔ اس نے بے شمار سرکاری ملازمین کو اُردو داں ہونے کی پاداش میں ملازمتوں سے علٰحدہ کر دیا تھا۔ اسی طرح ان کی کابینہ کے وزیر تعلیم پھول چند گاندھی نے ہزار ہا اساتذہ کو محض اُردو داں ہونے کے الزام میں علحدہ کر دیا تھا۔ جن پر کامریڈ مخدوم محی الدین نے اسمبلی میں کہا تھا ''پھول چند جی آپ کی تعلیمی پالیسی میں پھول چند اور کانٹے زیادہ ہیں'' ان اساتذہ کو مسٹر گردھاری لال بھٹناگر نے ایک انجمن کی جھنڈے تلے منظم کیا تھا۔ اس انجمن کے مشیروں میں جہاں دار افسر، مہدی عابدی اور احسن علی مرزا وغیرہ شامل تھے۔

اسمبلی کی اندر کامریڈ وی۔ ڈی۔ دیش پانڈے اور مخدوم محی الدین علحدہ کردہ ملازمین اور اساتذہ کی بحالی کے لئے لڑتے تھے اور اسمبلی کی باہر ملازمین اور اساتذہ کی انجمنوں کے ساتھ پولیس کی لاٹھیوں کا مقابلہ کرنے والوں میں وہی نوجوان تھے جنھیں انجمن ترقی اُردو کی سرپرستی حاصل تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد تمام سرکاری دفاتر کو اُردو دفتروں کا نام دے دیا گیا تھا۔ کیونکہ کام کرنے والے ملازمین بلحاظ مذہب وملت اُردو داں تھے۔ چنانچہ ریاست حیدر آباد کی سرکاری زبان اُردو تھی۔ ڈاکٹر یم چنا ریڈی جنھیں کچھ لوگ اُردو کا مربی اور سرپرست مانتے ہیں وہ وزیر سیول سپلائی تھے۔ انھوں نے سیول سپلائی کے ملازمین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ''اب اُردو چلنے والی نہیں ہے تلگو فوری سیکھو یا گھر میں بیٹھ جاؤ'' پولیس ایکشن کے بعد جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی جو لاکھوں اُردو کتابیں تھی انھیں بھی حکومت کی ہدایت پر اس وقت کے رجسٹرار ٹوپا صاحب نے نذر آتش کر دیا تھا۔ ان ناانصافیوں کے خلاف بھی ساری ریاست میں انجمن ترقی اُردو اور اس کے متعلقین جن میں جہاں دار افسر بھی شامل ہیں احتجاج کرتے رہے۔ غرض مہدی عابدی کا بیان ہے کہ جہاں دار افسر کو

اپنی زبان اور اپنی تہذیب سے بے پناہ محبت ہے وہ اُردو کی بقاء اور فروغ کے لئے وہ صرف فکرمند ہی نہیں بلکہ اس تحریک کے ایک مردِ مجاہد بھی ہیں۔[1]

**انعامات اور اعزازات:** صاحبزادہ جہاں دار افسرؔ کو اُن کی ادبی اور صحافتی خدمات پر مختلف اداروں سے گراں قدر ایوارڈ مل چکے ہیں جن میں سلطان العلوم لٹریری سرکل' گلبرگہ کا' بندہ نواز ایوارڈ' بھارتیہ کلچرل اکیڈیمی کا ایوارڈ' آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کا صحافت پر ایوارڈ جو چیف منسٹر شری این. ٹی. راماراؤ کے ہاتھوں عطا ہوا۔ قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھاریٹی کی جانب سے مسٹر رمنا چاری ائی. اے. ایس نے سنمانم کیا اور اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے صاحبزادہ جہاں دار افسرؔ کو اُن کی مجموعی خدمات پر بھی گراں قدر ایوارڈ دیا ہے۔ جو سابق چیف جسٹس آندھرا پردیش ہائیکورٹ جسٹس صغیر احمد کے ہاتھوں عطا ہوا۔ اس کے علاوہ ۱۴/ ستمبر ۱۹۹۴ء کو صاحبزادہ جہاں دار افسرؔ کی ادبی' سماجی' شعری اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں مختلف ادبی تنظیموں کی جانب سے ایک شاندار جشن منعقد ہوا تھا۔ جس میں انھیں ۳۱ ہزار ایک روپے پر مشتمل چیک بصورت کیسہ زر پیش کیا گیا۔ اس تقریب کا اہتمام مخدومؔ سوسائٹی' انجمن ترقی پسند مصنفین ' حیدرآباد لٹریری فورم' ادارہ شعر و حکمت اور سرور ڈنڈا میموریل سوسائٹی کی جانب سے کیا گیا تھا۔ صاحبزادہ جہاں دار افسرؔ کی خدمات کا اعتراف ایسے وقت کیا گیا جب کے انھوں نے اپنی زندگی کے ستر ۷۰ سال مکمل کر لیے تھے۔ اس جشن کی صدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کی تھی اور اس جلسے کو جناب زاہد علی خان ایڈیٹر سیاست' منوہر راج سکینہ ایڈوکیٹ' کمیونسٹ قائد کے۔ ایل. مہندرا' محبوب حسین جگرؔ' ایم ٹی خان صدر سیول لبرٹیز' مہدی عابدی' پروفیسر غیاث متینؔ' وقار خلیلؔ' وغیرہ نے مخاطب کیا تھا۔ اس موقع پر صاحبزادہ جہاں دار افسرؔ کی بکثرت گلپوشی کی گئی تھی۔ جناب زاہد علی خان صدر نشین تیاری اعتراف خدمات کمیٹی نے اس جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج ہم ایسے شخص کی زندگی کے عکس پر روشنی ڈالنے اور اعترافِ

---

[1] مہدی عابدی: جہاں دار۔ میرا ساتھی میرا دوست صفحہ نمبر (۲۸)

خدمات کے لئے جمع ہیں جو گذشتہ نصف صدی کا ایک روشن حصہ اپنے ساتھ رکھتا ہے انھوں نے کہا کے جناب افسرؔ نے ایک جاگیردار گھرانے میں جنم لیا لیکن جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا ہمیشہ اس گروہ انسانی کی ساتھ رہے جو ظلم کے بجائے انصاف کا قائل ہے اور جو انسانی بھائی چارگی میں بھروسہ رکھتا ہے حریت پسندی، جمہوریت دوستی، قومی یکجہتی اور سامراج دشمنی جسکا بنیادی مزاج و کردار ہے انھوں نے منفی رجحانات سے اعتراف کرتے ہوئے مثبت انداز کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے وہ دُھن کے پکے ہیں اور اپنی سیاسی، سماجی اور ادبی اصولوں کو لباس کی طرح نہیں بدلا آج ہم جہاں دارافسرؔ کی خدمات کا اعتراف ان کی موجودگی میں کرر ہے ہیں۔ ورنہ ہمارا معاشرتی مزاج ہمیشہ مردہ پرستی کا رہا ہے زوال نعمت کے بعد ہمیں قدر نعمت کی جستجو ہوتی ہے۔ کیسہ زر کی لاگت اگر چہ قلیل ہے لیکن اسکے پیچھے جو جذبہ ہے وہ انتہائی جلیل ہے۔

غرض اس جشن کا انعقاد اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دیر سے ہی سہی لیکن جہاں دارافسرؔ کی زندگی ہی میں ان کی خدمات کا اعتراف ایک زندہ اقدام ہے۔

## جہاں دارافسرؔ کے خد وخال اور روز و شب

قد:۔ ۵ فٹ ۷ انچ

لباس: ابتدائی عمر میں گھر اور دعوتوں کیلئے شیروانی، مصری ٹوپی اور سلیم شاہی جوتا زیب تن کرتے تھے۔ اور اسکول کے زمانے میں مدرسہ عالیہ کا یونیفارم پہنتے ۱۹۴۵ء کے دوران پرانے شہر میں وہ پہلے نوجوان تھے۔ جو نہرو شرٹ اور پاجامہ زیب تن کرتے ہوئے راستوں پر نظر آتے تھے۔ جس سے سارے افراد خاندان ناراض ہوتے تھے۔ لیکن پولیس ایکشن کے بعد یہ لباس عام و خاص ہوگیا۔ جب مونسپل کونسلر بنے تو اپنے حلقہ انتخاب مغلپورہ کے روایات کے مطابق شیروانی زیب تن کیئے ایوانوں میں شرکت کرتے تھے۔

وضع قطع: جہاں دار افسؔر کے افراد خاندان کا کہنا ہے کہ وہ جوانی میں مشہور فلمسٹار اشوک کمار کے نام سے مشہور تھے۔ چنانچہ آصف سابع کی وفات کے بعد چودہ ہزار ملازمین صرف خاص کو ایک جنبش قلم سے علحدہ کر دیا گیا اور چودہ ہزار خاندان حالات کے رحم و کرم پر اچانک چھوڑ دیے گئے تو علحدہ کردہ ملازمین کی ایک انجمن بنائی گئی۔ جس کے مشیر کامریڈ مخدوم محی الدین، صدر۔ کے۔ یل۔ مہندرا اور معتمد جہاں دار افسؔر بنے۔ جب نئے جانشین مکرم جاہ بہادر سے اراکین انجمن کی ملاقات کا وقت مقرر ہوا تو پہلے کنگ کوٹھی کی سیکورٹی سے ملنا پڑا اُس وقت کے چیف سیکورٹی آفیسر بریگیڈیر توفیق علی تھے۔ اُنھوں نے جہاں دار افسؔر کا نام چھوڑ کر دوسرے دو ارکان کا نام پوچھا۔ پہلا نام کامریڈ مخدوم محی الدین کا تھا۔ اور دوسرا نام مہندرا کا تھا۔ اِن دونوں نے کہا کہ آپ نے جہاں دار افسؔر کا نام نہیں لکھا۔ تو بریگیڈیر توفیق علی نے ہنستے ہوئے کہا کہ میں پہلے اُن ہی کا نام اشوک کمار لکھ لیا ہے۔ اس پر سیکورٹی روم میں قہقہہ گونج اُٹھا۔

غذا: جہاں دار افسؔر گیہوں۔ انڈا۔ گوشت۔ گھی مرغ اور مچھلی۔ شوق سے کھاتے ہیں۔ ان کی پسندیدہ غذا شامی۔ شکم پور کٹ لیس۔ سیخ کباب۔ ہریس۔ چکن 65 اور تو تک (صموصہ جس میں گوشت پوشیدہ ہوتا ہے)۔ وہ ہر قسم کے میٹھے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

ناس: جہاں دار افسر ناس کے بڑے شوقین ہیں وہ ۱۹۵۶ء سے ناس لیتے ہیں جو تاحال جاری ہے۔ پنچ پھول؛ پنجابی نسواڑ ناس لیتے ہیں جو بڑی خوشبودار ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتے وہ پہلے بکثرت سگریٹ استعمال کرتے تھے۔ اب کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں۔

مشروبات: **Maza** ان کا بہت پسندیدہ مشروب ہے۔ بچپن سے آئسکریم کے شوقین ہیں۔ اسطرح چسکی کے نہیں بلکہ چسکے کے عادی ہیں۔

نوجوانی کا خوشگوار واقعہ: حسن آنکھوں کیلئے اور دل کے لئے دوزخ ہے۔ اُنھوں نے آنکھوں کی جنت کو دل کی دوزخ تک پہنچنے نہیں دیا۔ یوں بھی اُن کی شادی بہت کم عمری میں اِن کی ننھیالی عزیزہ سے ہوئی۔ اُنھیں جب پہلی اولاد ہوئی تو وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل کے پے انگ روم میں نرسوں کا ہجوم

ہو گیا تھا۔ کہ اتنا کم عمر لڑکا باپ بن گیا ہے ابھی حال تک کوئی گھر پر آتا تو اُن کے لڑکوں سے کہتا تھا کہ ذرا آپ کے بڑے بھائی کو بلائیے۔

**زندگی کا حاصل:** جہاں دار افسرؔ نے بتایا کہ ان کی زندگی کا حاصل حصول علم شعور اور ادراک ہے جو ایوانات شاہی میں جنم لیا۔ آج ایک کرایہ کے بوسیدہ گھر میں رہتا ہے۔ امیر گھرانے کا فرد ہونے کے باوجود ایک غریب کی طرح کی زندگی گذارتا ہے انھوں نے بتایا کہ جب وہ اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو احساس ہوتا کہ ''سو سے بُرا تو لاکھوں سے اچھا بنا دیا'' حرص دنیا نہیں ہے۔

**مصروفیات شب و روز:** صبح ہوتے ہی جہاں دار افسرؔ اخبار بینی اور دیگر مشاغل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ضروری ناشتہ اور اس کے فوراً بعد ہی چائے بے حد ضروری ہے اگر دیر ہو جائے تو تیوری پر بل آ جاتے ہیں اور چھوٹی بہو سے شفقت آمیز شکایت ہوتی ہے۔ ناشتہ کے ساتھ ہی چائے پینے کی عادت بچپن سے ہے۔ وہ جب عالیہ بورڈنگ ہاؤس میں بوڈرس تھے تو ناشتہ کے ختم کے ساتھ ہی چائے بازو رہتی تھی۔ ناشتہ کے ساتھ ہی یا ناشتہ سے قبل ضرورت مند گھر آ جاتے ہیں اور اپنے کسی کام کے لئے انھیں اپنے ساتھ لے نکلتے ہیں۔

# شخصیت

کسی شاعر کی شخصیت کا مطالعہ ایک عام انسان کی شخصیت سے جداگانہ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ ورڈ سوتھ شخصیت اور فن کے تعلق سے اپنی تمہید میں یہ سوال اٹھاتا ہے۔ کہ شاعری کیا ہے؟ اور خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ:

''شاعر ایک ایسا آدمی ہے جس کا ادراک زندہ ہے جس میں دوسروں کے مقابلے میں جذبات زندہ ہیں جو انسانی فطرت سے زیادہ واقف ہے جو اپنے جیسے جذبات اور ارادوں کو دیکھ کر اُن پر غور کرتا ہے اور پھر اُن کی تخلیق کرتا ہے چونکہ شاعری بیساختہ جذبات کا اظہار ہے اس لیے اسے نا تو سیکھا جا سکتا ہے اور نہ اس کے بندھے ٹکے اُصول ہو سکتے ہیں شاعر معمولی انسان نہیں ہوتا وہ کچھ مخصوص صلاحیتوں کو لے کر پیدا ہوتا ہے اس لئے انفرادیت شاعر اور شاعری دونوں کے لئے اہم چیز ہے[1]

ورڈ سوتھ شاعری کے تعلق سے یہ بھی کہتا ہے کہ شاعری دل کی آواز اور جذبات کے بے ساختہ اظہار کا نام ہے۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے رابرٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

شخصیت کی واضح تعریف کرنا بہت مشکل ہے مگر سرسری طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شخصیت کسی انسان کی حرکات و سکنات کا مجموعہ ہوتی ہے جس کا مظاہرہ وہ اپنی عادات' خیالات' اظہار بیان' رجحانات' میلان طبع طرز عمل اور فلسفہ حیات کے سمٹنے میں کرتا ہے[2]

کارل یونگ نے شخصی خصوصیات میں دو خوصوصیات پر خاص توجہ دی ہے جو بیرون بینی اور دروں بینی کے نام سے موسوم کی گئی ہیں بیرون بینی میں ایک شخص' اپنے خیالات' احساسات اور میعار حیات میں دلکشی محسوس کرتا ہے اور مظاہر عالم کا مطالعہ کرتا ہے دروں بینی میں شخص کے خیالات و افکار منصوبہ بند ہوتے ہیں اور اُس کی نظر مستقبل پر ہوتی ہے۔ اور وہ کائنات کے مخفی اسرار کا جائزہ لیتا ہے[3]

کارل یونگ کی ان دو خصوصیات میں کئی اور صفات شامل کی جا سکتی ہیں اکثر شخصیتیں ان دونوں خصوصیات کے درمیان سے اپنے لئے راستہ بنا لیتی ہیں جس کی وجہ سے وہ شخصیتیں توازن پسند ہو جاتی ہیں ماہرینِ نفسیات نے شخصیت کی تعمیر اور تخریب میں بارہ خوبیوں اور بارہ خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ان خوبیوں اور خامیوں کے امتزاج سے سماجی رویہ سے نبرآزما ہونے کی صلاحیت بھی وقوع پزیر ہوتی ہے۔اگر یہ امتزاجی کیفیت کسی شاعر میں موجود ہو تو وہ سماج کے سلگتے ماحول میں اپنی شاعرانہ حسیت کو بیدار رکھتا ہے۔ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے اپنے ایک مقالہ میں تحریر کیا ہے کہ

> "شاعر کی حیثیت ایک عام انسان کی شخصیت سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ یہاں شخصیت کے دُہرے اظہار سے واسطہ پڑتا ہے۔ایک اظہار تو سماجی رویّہ ہے اور دوسرا اظہار فن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے"[۴]

ان خیالات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شخصیت کو فن کی معرفت سے جانا پہچانا جاتا ہے.لیکن اس کے ارتقائی شکل میں نمودار ہونے تک زندگی کے مختلف عناصر اور عوامل شخصیت کی تعمیر میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ جس میں سماجی رویّہ اور روایات بھی شامل ہیں۔شخصیت کردار اور افکار، جذبات اور احساسات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔داخلی اور خارجی کیفیات کے زیر اثر شخصیت کردار و افکار کے آئینہ میں ایک متوازن صورت سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور ایسی شخصیت میں خیال وفکر کی ہمہ گیری ہوتی ہے۔شخصیت جامع صفات ہو تو وہ سماج کی فطرت اور سماج کا دل بن کر دھڑکتی ہے۔ اس کی فطرت کو ایک صحت مند نظرئے سے روشناس کرنے کی کوشش کرتی ہے۔شخصیت جب متوازن ہو جائے تو وہ ایک ایسا دردمند دل رکھتی ہے۔جو سماج میں وقوع پزیر ہونے والے واقعات وحادثات پر گہری نظر رکھتی ہے۔

متوازن شخصیت ایک ایسا دردمند دل رکھتی ہے جس میں ایک سمندر کی گہرائی ہوتی ہے وہ زمانے کے نشیب و فراز کو دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والے احساسات کے مدوجزر میں محسوس کرتی ہے متوازن شخصیت مجاہدانہ زندگی کو پسند کرتی ہے، افسردگی، پس مردگی، رنجیدگی کو سنجیدگی سے بدل دیتی ہے وہ قنوطیت کے بجائے بشاشیت کی علمبردار ہوتی ہے۔

متوازن شخصیت کا احساس خزاں رسیدہ چمن میں رہتے ہوئے بھی نئی بہارِ جانفزا کا منظر رہتا ہے۔ وہ امروز پر یقین رکھتے ہوئے فردا کیلئے نئے تعمیری منصوبے بناتی ہے۔ خدا کی عطا کردہ زندگی کو صحیح سمت پر گامزن کرنے کے لئے اپنی توانائیوں کو صداقت کے ساتھ صرف کرنے کی قائل ہوتی ہے۔ اور اُسکی تمام تر توانائیوں کا مقصد صرف انسان اور انسانیت سے پیار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

جہاں تک جہاں دار افسرؔ کی شخصیت کا تعلق ہے۔ اُن کے فکری احساسات کے تجزئے سے ایک متوازن شخصیت کا روپ سامنے آتا ہے۔ جس زمانے' ماحول اور سماج میں ان کی شخصیت پروان چڑھی ہے وہ تخریب کے پہلو میں تعمیر نو کا پیش قیمہ ثابت ہوئی۔ جب اُن کے جذبات نے اظہارِ بیاں کیلئے لب ولہجہ عطا کیا تو اُن کی شاعری فن کی صورت میں زندگی کی ترجمان بن گئی۔ جس کا ادراک زندہ رہتا ہے وہ فرسودہ زوال آمادہ رجحانات اور منفی روایات سے ہمیشہ منحرف رہتے ہیں۔ حق گوئی کے لئے طوق وسلاسل سے پیار کرنا اُن کی زیست کا حاصل ہوتا ہے۔ جہاں دار افسر نے اسی سطح پر اپنے ادراک کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی روداد حیات لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ سب سے پہلے ہندوستانی ہیں۔ مفہوم کے اعتبار سے لفظ ہندوستانی خود اپنے اندر ایک ایسی جامعیت رکھتا ہے ۔جس میں گنگا جمنی تہذیب کے آبدار موتی انسانیت کے دامن میں جھلملاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔جس میں پیار' محبت خلوص کی پرکشش جاذب نظر ہوتی ہے۔

جہاں دار افسرؔ کی شخصیت کا روشن پہلو' احترام آدمیّت ہے۔ اور یہ اُن کا بنیادی تصوّر بھی۔ اُنھوں نے جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پائی اور شاہی گھرانے میں آنکھ کھولی مگر اس کے باوجود ان کی فکری انفرادیت کھلے آسمان کے نیچے بے سہارا مظلوم انسانوں کی بستی میں رہنا پسند کرتی ہے۔ متوازن شخصیت کا یہ بھی خاصہ رہا ہے کے وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتی ہے۔ اس کے عزائم مشکل حالات میں بھی ثابت قدمی کا اظہار کرتے ہیں۔ جہاں دار افسرؔ کے عزائم میں بھی ایسے ہی جوہر موجود ہیں جس کی ضیا پاشی ماحول کی ظلمتوں کو مٹانے کا قرینہ رکھتی ہے۔ ان کے مقصد حیات میں زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کا نعرہ بھی شامل رہا ہے۔ زینہ عروج پر اپنے ظرف کو قائم رکھنا اور زوال کی دہلیز پر ضمیر کو بچانا ایک مجاہدہ سے کم نہیں لیکن ایسا مجاہدہ بہت کم لوگوں کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔ طبیعت

میں جس کے خودداری ہوتی ہے وہی اس کردار کو بخوبی نبھا سکتے ہیں۔ جہاں دار افسر کی شخصیت میں فکری انفرادیت اس حقیقت سے آشنا رہی ہے۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں۔

"میں اپنے ظرف اور اپنے ضمیر کی سلامتی کے ساتھ اُصولوں کی جنّت بنانے میں مگن رہا۔ اس طرح میں نے ہر اپنی چیز کو جاتے دیکھا مگر اپنی طرف کچھ آتے نہیں دیکھا۔ مجھے اسکا کوئی رنج و ملال بھی نہیں۔ میں ڈوبتے ستاروں کا ماتم گُسار نہیں۔ آفتاب تازہ کا استقبال کنندہ ہوں۔ خاندان کی حد بندیوں کا اسیر رہنے کے بجائے میں نے خود کو عالمی انسانی برادری کا ذہنی رشتہ دار بنالیا جو اعلیٰ انسانی اقدار کی پاسداری، حریت پسندی، جمہوری پیش رفت کے لئے اپنے حالات کے مطابق مصروف جہاد رہے تاکہ دنیا سے رنگ و نسل مذہب و فرقہ کی تنگ نظری کے اندھیرے مٹ جائیں۔ سامراجی ریشہ دوانیاں نیست و نابود ہوں اور سماجی انصاف سب کا مقدر بن جائے [۵]

جہاں دار افسر نے اپنی شخصیت کے کردار میں دو اہم صفات کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ یعنی جو چیز مٹنے والی ہے یا مٹ چکی ہے اُس کو بھول جانا چاہیئے۔ اور جو چیز اب ہے یا آنے والی ہے اس کو خوش آمدید کہنا۔ اس نظریئے کے تحت انھوں نے اندھیروں سے ناطہ توڑ کر اجالوں سے رشتہ جوڑنے کے لئے مثبت قدم اٹھایا اور کہیں کہیں انھوں نے اس اندھیرے، اجالے کے دوراہے پر ایک صالح معاشرے کو بیدار رکھنے کی کوشش کی۔ اور وہ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہے یا اُن کے سینہ سوزاں میں ایک انقلابی کامیابی کی آرزو مچلتی رہی یہ ان کے کلام کے مطالعہ اور مشاہیر کے اقوال سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔ جسٹس سردار علی خاں "جہاں دار افسر حیات و کائنات کا شاعر" میں کہتے ہیں۔

افسر صاحب کا جنم جاگیر شاہی گھرانہ میں ہوا مگر وہ ہمیشہ جمہوریت سیکولرزم اور قومی یکجہتی کی آواز بنے رہے۔۔۔۔۔۔ انھیں اپنے عوام، اپنے ملک اور اپنے شہر سے بے پناہ پیار رہا اور ہمیشہ عام آدمی کے دکھ درد میں شریک رہے۔

جہاں دار افسر کی شخصی صفات اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ وہ ایک آدمی کے ساتھ رہ کر بھی ایک عام آدمی نہیں رہے۔ کیونکہ انھوں نے ایک ایسا دردمند دل پایا ہے جس میں زندگی کے بے شمار غم سمو لینے

کی صلاحیت موجود ہے۔' اُن کی حیات کا رویہ سانحات سے رشتہ استوار رکھنے کا عادی رہا ہے۔اس لئے اُن کے دل کے پردے پر جب بھی درد کی تصویر ابھرتی ہے تو اس میں غم کے ہزار رنگ جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اور یہی رنگ اُن کے فکر و خیال میں اس انداز سے رنگ آمیزی کرتے رہے ہیں کہ اُنھیں زمانے کا غم بھی اپنا غم محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور یہی اُن کی متوازن شخصیت کا ایک انفرادی رنگ ہے۔

جہاں دار افسر کی زندگی نے غمِ دوراں کو ایک مرکزی نقطہ نگاہ سے جانچا اور پرکھا ہے۔اور اس غم کو اوروں میں باٹنے کے لئے اور اپنے فکر و خیال کی تبلیغ کے لئے اُن کے لئے یہی دو ذرائع ممد و معاون ثابت ہوئے. اور ادب وصحافت کے ذریعے مشن کو جاری اور ساری رکھا ہے۔اور یہی خصوصیت جہاں دار افسر کی متوازن شخصیت کی آئینہ دار ہے۔

جہاں دار افسر کی اسی متوازن شخصیت کو مرحوم محبوب حسین جگر نے روشنی' روشن خیالی'' اور رہنمائی کے نئے سفیر'' سے تعبیر کیا ہے۔

شخصیت جب کسی فن لطیفہ سے وابستگی اختیار کر لیتی ہے تو وہ اپنی زندگی کے مذاق اور شعور کے تحت اس فن کو زندگی کا ماحاصل سمجھتی ہے۔ایسی شخصیت فن کو زندگی کا ایسا رُخ سمجھتی ہے جس کے بغیر شخصیت ادھوری اور زندگی کے سہانے خواب ادھورے نظر آتے ہیں۔ایک لحاظ سے شخصیت اور فن زمانہ اور سماج کے درمیان اپنے احساس فکر کے زِیر اثر متوازن فکر و عمل کے ذریعہ دنیا کو درس آ گہی دیتے ہیں۔

جہاں تک جہاں دار افسر کی شخصیت اور فن کا تعلق ہے۔انھوں نے ان ہی کی نظریات کے تحت اپنی زندگی کی تصویروں میں اس انداز سے رنگ آمیزی کی ہے جس سے فن برائے فن نہیں رہتا بلکہ ان کا فن برائے زندگی کے قدروں کی حمایت کرتا ہے وہ اپنی عملی زندگی میں صرف ایسا کارہائے نُمایاں چاہتے ہیں۔جس سے انسان اور انسانیت کو تفخر حاصل ہو سکے۔اور اس فخر کو وہ اپنی زندگی کا انعام سمجھتے ہیں۔ جو احساس اُن کے دل میں موجزن ہے وہی تڑپ بن کر زبان پر آ جاتی ہے دل و زبان کی اس رفاقت نے اُن کو صداقت پسندی کی طرف مائل کیا ہے۔اور یہی صداقت جب فکر و خیال کے میزان میں تُلتی ہے تو وہ ایک فن پارہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔فن پارہ کی صورت

میں جب صداقت مقصد زندگی قرار پائے تو زندگی کے بہت سے مسائل اس اظہار بیان کے توسط سے حل ہو جاتے ہیں۔ شاعر کے مطمحِ نظر صرف صداقت کی پاسداری ہو تو اس کی پزیرائی ہر جگہ ہو سکتی ہے۔ اور یہی سب کچھ جہاں دار افسر کے جذبۂ شعری میں موجود ہے۔

کسی کا قول صادق ہے شاعری حیات سے پیدا ہوتی ہے۔ حیات سے متعلق ہوتی ہے اور حیات ہی کے لئے زندہ رہتی ہے اس جامع اور مختصر فقرے میں شاعر کی حیات اور شاعری دونوں ایک فیضانِ لطیف سے روشناس ہوتے نظر آتے ہیں۔ جب فن حیات سے متعلق ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کے ایسے پہلو کی عکاسی کرتا ہے جو سب سے زیادہ جذبات انگیز رہا ہے۔ شاعر کے جذبات کی برافروختگی جب کسی فن پارے کی تخلیق کرتی ہے تو اُس فن پارہ میں اسکی آنکھوں کا نور اس کے جگر کا خون اور اسکے دل کی دھڑکن شامل رہتی ہے۔ ایک شاعر جب احساس کے اس تناظر میں دیکھتا ہے تو اس کو غم آشنائی اور انبساط انگیزی دونوں سے اپنا رشتہ جوڑنا پڑتا ہے۔ رنج وطرب کی اس ذہنی رشتہ داری میں جس کا اثر سب سے زیادہ ہوگا وہی اثر شاعر کے جذبات کی ترجمانی کرے گا۔ اور یہی جذبات خارجی اور داخلی کیفیات کے روح افزا و روح فرسا مناظر کے ترجمان ہوتے ہیں۔

شخصیت کے دو روپ ہوتے ہیں۔ ایک روپ ظاہری ہوتا ہے۔ اور دوسرا باطنی۔ ظاہری روپ شخصیت کی وضع قطع عادت واطوار سے تعلق رکھتا ہے تو باطنی روپ شخص کے جذبات' خیالات' احساسات کردار و اخلاق کی نمائندگی کرتا ہے۔

جہاں دار افسر کی شخصیت کا ظاہری روپ تو یہی ہے کے وہ اوسط قد کے دبلے پتلے چھریرے بدن کے انسان ہیں۔ آنکھیں سیاہ بڑی بڑی جس میں غور وفکر کی گہری خاموشیوں کا طوفان چھپا ہوا۔ ستواں ناک' کشادہ جبیں' اور جبیں پر ایک ہلکی سی شکن تھڈی پر فرنچ کٹ داڑھی اور مونچھ داڑھی سے ملی ہوئی۔ گندمی رنگ چہرے سے شخصیت کے معتبر پن کا اظہار لبوں پر دمِ گفتگو ہلکا سا تبسّم جو کسی کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے کافی' ہے۔ یہ تو حُلیہ اس وقت کا ہے جب کہ وہ اپنی عمر عزیز کے ستر (۷۰) برس ختم کر چکے ہیں۔ لیکن جنہوں نے ان کا عنفوان شباب اور عالم شباب دیکھا ہوگا وہ بانکے سجیلے، کڑیل نوجواں کی تصویر اب تک اپنی آنکھوں میں لئے پھرتے ہونگے اور شاید یہی

ان کے لئے کھلی آنکھوں کا خواب ہوگا۔ خیر آگے دیکھئے آواز میں نرمی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہوئی زیبائش لباس میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں کبھی بُشرٹ کبھی شرٹ کبھی کرتا پائجامہ اور کبھی شیروانی ٹوپی میں کبھی برہنہ سر نظر آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں انھیں خاندانی وراثت میں وہ تہذیب بھی ملی تھی جو ان کے آباواجداد کے لئے مخصوص رہی ہوگی۔ شیروانی کے ساتھ دستار کمر میں بگلوس پاؤں میں سلیم شاہی جوتا ہاتھ میں عصائے چوبی یا مرصع شمشیر کمر میں خنجر زریں لیکن یہ تہذیبی وضع قطع اور لباس جہاں دار افسرؔ کے پروان چڑھنے تک ختم ہوچکی تھی۔ اور یوں بھی جہاں دار افسر نے ایسی افتادِ طبع پائی ہے اور یہ بھی تو مشہور ہے کہ لوگ جھونپڑیوں میں رہتے ہوئے محلوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے وہ محلوں میں رہتے ہوئے جھونپڑیوں کے خواب دیکھتے رہے۔ وہ نواب و جاگیردار بننے کے بجائے غربت کے عذاب کو سہنا پسند کیا۔ یہ کمالِ انکساری اُن زندگی کے انقلابی جذبوں کی عکاس رہی ہے۔ کیونکہ انھوں نے قلی قطب شاہ کے طرح بالا حصار سے چار مینار کے دامن میں بسی غربت کی زندگی کو بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھا ہے۔ اور یہی زندگی اُن کے لئے کھلی آنکھوں کا خواب ثابت ہوئی.

اور یہ ایسا خواب ہے جو برسوں بعد شاید شرمندہ تعبیر ہو۔

## حواشی :

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ارسطو سے ایلیٹ تک۔ ص (۴۵)

۲۔ میر احمد علی الھامؔ واحدی مقالہ شارب اورنگ آبادی صفحہ (۱۰۰)

۳۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی غالبؔ کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ۔ صفحہ (۲۳)

۴۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی فصاحت جنگ جلیلؔ شخصیت و شاعری۔ صفحہ (۱۸۹)

۵۔ جہاں دار افسرؔ مضمون مجھے کچھ کہنا ہے ماخوذ از مجموعہ کلام کھلی آنکھوں کے خواب' صفحہ (۱۶)

# جہاں دار افسرؔ کا شعری مجموعہ

## کھُلی آنکھوں کے خواب.......اجمالی تعارف......

''کھلی آنکھوں کے خواب'' جہاں دار افسرؔ کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۹۴ء میں اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی جزوی اعانت سے حیدرآباد سے شائع ہوا۔ ''انتساب'' صفحہ (۳) اُن معزز ہستیوں کے نام ہے جنہوں نے شاعر کی زندگی میں شفقت، رفاقت اور رہنمائی کے اعلیٰ صفات کے ذریعہ انقلاب پیدا کیا۔

صفحہ (۴) پر دوست احباب کی ایک طویل فہرست ہے جن کے نام اس شعری مجموعے کو اُنکے مخلصانہ جذبے کے تحت نذر کیا گیا ہے۔ اس شعری مجموعے کے صفحہ (۶) تا (۱۰) جسٹس سردار علی خاں نے ایک مضمون بعنوان ''جہاں دار افسرؔ حیات و کائنات کا شاعر'' سپردِ قلم کر کے اپنا حقِ دوستی ادا کیا ہے۔ موصوف کا مضمون ایک تاثراتی تنقید کی حیثیت رکھتا ہے۔ موصوف نے اُس شعر کو بھی نظرِ قرطاس کیا ہے۔ جس کو سن کر جگر مراد آبادی پھڑک اٹھے تھے۔

شبِ فرقت سحر تک میں بھی رویا شمع بھی روئی
مرے مانند وہ بھی دل جلی معلوم ہوتی ہے

یہ شعر اور غزل موجودہ شعری مجموعہ میں نہیں ہے۔ 'کھلی آنکھوں کے خواب' کے صفحات (۱۱) تا (۱۶) مصنف نے ورق ورق زندگی کے عنوان سے زندگی کے واقعات (۷۰) سطروں میں اس اختصار سے قلم بند کیا ہے کہ زندگی کے ستر سال کا پورا پورا احاطہ ہو جاتا ہے اور کوئی گوشہ آنکھوں سے اوجھل ہونے نہیں پاتا اس انداز تحریر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا یہ کیلنڈر ایک چھوٹے

سے (cassette) کیسٹ میں مقید ہو گیا ہو اور جسے جہاں چاہے آن کر کے سُنا جا سکتا ہے۔ اس شعری مجموعے کے صفحات (۱۶) تا (۱۸) ''مجھے کہنا ہے کچھ'' میں جہاں دارافسرؔ نے اپنی آپ بیتی کو پیش کیا ہے جس سے اُن کی زندگی کے محرکات اور زاویہ نگاہ سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ درمیان میں تصاویر کے ذریعہ ربط باہمی اور خلوص بے پایاں مسکراتے ہوئے منظر پیش کیے گئے ہیں۔ 'کھلی آنکھوں کے خواب' کا آغاز صفحہ (۱۹) دعا سے شروع ہوتا ہے صفحہ (۲۰) اور (۲۱) پر نعت ﷺ تبرکاً پیش کی گئی ہیں اس کے بعد سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی معریٰ نظمیں' غزلیں' اور قطعات و متفرق اشعار اس شعری مجموعے میں شاعر کے نازک اور لطیف احساسات کے ترجمان ہیں۔ اس شعری مجموعے میں

نعتیں (۲)

نظمیں (۵۲)

غزلیات (۴۲)

قطعات (۱۱)

متفرق اشعار (۵۸) ہیں

کھلی آنکھوں کے خواب کا یہ اجمالی تعارف تھا۔ تفصیلی بحث مختلف عنوانات کے تحت آئندہ سطور میں آئے گی۔

# جہاں دار افسرؔ کی شاعری

جہاں دار افسرؔ کی شاعری اُن کے دل و احساسات کی ترجمان ہے۔ اُنھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی وہ ماحول زندگی کی کرب ناکیوں سے بھرپور رہا ہے۔ یہ زندگی کا المیہ نہیں تو اور پھر کیا ہے۔ ہر طرف قتل و غارت گیری کا بازار گرم ہے انسانیت کے بازار میں رنگ و نسل کے جھگڑے۔ اور لسانی تعصب اور کہیں مذہب کے خلاف حسد کی آگ بھڑکتی ہوئی اور کہیں فرقہ پرستی کی دیواریں کھڑی ہوئیں۔ زندگی مایوسیوں اور محرومیوں کی آماجگاہ یہ زندگی کا المیہ کسی فرد یا سماج کا نہیں بلکہ اس آگ میں ایک دنیا لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ جہاں دار افسرؔ اپنے سینہ میں ایک حساس اور دھڑکتا دل رکھتے ہیں۔ وہ ان واقعات اور حادثات سے کس طرح متاثر نہ ہوتے۔ شاعر کے جذبات و احساسات ہر منظر کا اثر قبول کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کا درد حرفِ دُعا کی صورت میں لبوں پر سسکنے لگتا ہے تو جذبہ ذروں سے ایک ہوک سی اُٹھتی ہے۔ اور وہ اپنے خدا سے بصد عجز و نیاز کہتے ہیں۔

خدا سے بس یہی میری دعا ہے
دکھی انسانیت سے پیار افزوں ہو

خداوند
یہ رنگ و نسل
تعصب تنگ نظری بے یقینی کی فضا سے
بشر آزاد ہو جائے۔

وہ اپنی دعا میں ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے یہ آرزو کرتے ہیں کہ انسان کو آزادی محض اس لئے ملی ہے کہ وہ اپنے ارادے اور قول سے بارگاہ خداوندی میں اپنی عبدیت کا سچے دل سے اقرار کرے اور اس کی عبودیت، اس کی عظمت و جلالت کا فیضان اس طرح اثر کر جائے کہ خدا کے

سوائے کسی کا خوف دل میں نہ ہو۔ یہی وہ ایمانی جوہر ہے جو انسانیت کی بقا کے بھی کام آتا ہے۔ انسان دنیا میں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے اور مخلوقِ خدا میں جس کا جو مرتبہ ہے اس کا لحاظ رکھے حقوق العباد کے مطمح نظر وہ خدا کی بارگاہ میں تڑپ کر کہتے ہیں

اے ربُ العالمیں

مرے کشکول میں کچھ تو عطا ہو

ابوبکر و عمر عثمان و علی کا جھوٹا

کہ انسانیت کی بارگاہ میں

شادمانی سے حیات چند روزہ جی سکوں

اور ترے بندوں کے کام آؤں۔

جہاں دار افسرؔ نے اپنی شعری مجموعے کو زیادہ تر معریٰ نظموں سے آراستہ کیا ہے آزاد نظمیں عروض آہنگ سے وابستہ ہوتی ہیں لیکن اس میں خیال کی آزادی ہوتی ہے۔ ترقی پسند شعراء نے اس صنف سخن کو اپنا کر فکری احساس کو وسعت دی ہے۔ جہاں دار افسرؔ کا فکری احساس بھی زیادہ تر آزاد نظموں سے متعلق رہا ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنے شعری مجموعے میں پہلے آزاد نظموں کو جگہ دی ہے۔ اور پھر غزل کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ آزاد نظموں میں دعا کے بعد سب سے پہلی نظم ''دعائے نیم شبی'' لکھی گئی ہے یہ نظم بحر متقارب کے فارم (Form) میں لکھی گئی ہے جس کا وزن فعولن (چار بار ہے) اس نظم میں نعتیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اور جو تاثر پیش کیا گیا ہے وہ دل میں چھپے ہوئے درد کا اظہار اس انداز سے کرتا ہے کہ آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ اس نظم میں اللہ کے محبوب بندے نبی کریم ﷺ سے یہ التجاء کی گئی ہے کہ زمانہ ظلمتوں کی گھٹاؤں میں چھپ گیا اور ہر طرف اندھیروں کا راج ہے۔ اور اس اندھیروں میں سرکار ﷺ کی اُجلی ردا ہی میں پناہ لینے سے زندگی کو سکون اور اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ اور جہاں دار افسرؔ اسی دامنِ رحمت کے آرزو مند ہیں۔ نظم کے اشعار ہیں

اے قندیلِ حکمت

اے رحمت سراپا

مجھے تیرگی سے بچالے

میں گرنے لگا ہوں

مجھے تھام لے

آسرا دے مجھے

اپنی اجلی ردا میں۔

نام لیوا ہوں اس روشنی کا

ازل سے ابد تک جو قائم رہے گی

اس نظم کا جو تاثر ہے وہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے جو شاعر نے دعائے نیم شبی کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ دیگر نظموں اور غزلوں پر بحث آئندہ صفحات میں کی گئی ہے۔

# جہاں دارافسرؔ کی غزل گوئی

جہاں دارافسرؔ نے خود اپنی شعر گوئی اور شعر فہمی کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''میں میرؔ، غالبؔ، یگانہؔ، جوشؔ، جگرؔ سے لے کر مخدومؔ، علی سردار جعفریؔ، کیفی آعظمیؔ، ساحرؔ لدھیانوی اور جانثار اخترؔ، سلیمان اریبؔ، عزیز قیسیؔ کا پرستار ہوں احمد ندیم قاسمیؔ، حمایت علی شاعرؔ، احمد فرازؔ، قمر ساحریؔ بھی میرے پسندیدہ شعراء میں ہیں۔ خود کو ترقی پسند تحریک کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ مگر میری شاعری میں محض قافیہ پیمائی نہیں میرا ذہنی جھکاو۔ نظم کی طرف زیادہ ہے۔ میں شاعری میں جدید تجربوں کا بھی قائل ہوں اور بہت سے ایسے جدید شعراء کو بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں جن کی شاعری میں زندگی سے فرار کا احساس نہو، جن کی تنہائی بھی ایک صحت مند رخ رکھتی ہے اور ترسیل وابلاغ کے المیے سے دوچار نہیں ''

جہاں دارافسرؔ کی شخصیت میں ان خیالات ہونا ضروری بھی ہے۔ کیونکہ انھوں نے ایسے دور میں اپنی شعور کی آنکھیں کھولیں جبکہ بساط سخن پر غزل اور نظم ایسے تجربوں سے گزر رہی تھی جہاں نظام فرسودگی جاں بلب تھا اور کشمکش حیات، زندگی کے نت نئے مسائل کا جائزہ لے رہی تھی۔ لیکن صاحبانِ علم وفن کے اس دور میں بھی پُرانی قدروں کا بھی تحفظ چاہا اور نئے قدروں کو بھی مستحسن نگاہوں سے دیکھا۔ کیونکہ اُن کی دانست میں یہ حقیقت بھی آشکار تھی کہ جس کو اساتذۂ سخن نے جس جگر کاوی سے چمنستانِ سخن کو آراستہ و پیراستہ کیا اس کو یک لخت نظر انداز کردینا نہ صرف شعروادب سے بغاوت ہوگی بلکہ اُسکے حق میں سراسر ظُلم کے مترادف ہوگا۔ جیسا کہ جہاں دارافسرؔ نے ایسے پرآشوب دور میں چند چنندہ شعراء کو اپنے فہرستِ خیال رکھکر اپنے شعروسخن کی آبیاری کی۔ جس سے بنیادی طور پر اُنھیں خاطر خواہ فائدہ ہوا ہے۔ میلان طبع کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو نظم کا شاعر کہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ پُرانی روایات کے بھی قدرداں رہے ہیں اور انھیں غزل جیسی لطیف و نازک

صنف سخن سے بھی محبت رہی ہے ورنہ وہ میرؔ، غالبؔ، یگانہؔ، جوشؔ، جگرؔ، فانیؔ کے نام خاص طور سے نہیں لیتے۔ان کو جہاں میرؔ کے سوز و گداختگی، نشتریت، رنگینی، ملاحت، شیرینی اور شوخی سے پیار ہے۔ وہیں پر وہ میرؔ کے اخلاص، وارداتِ عشق، حسن بیان سے عقیدت رکھتے ہیں۔

بقول اعجاز حسین ''میرؔ کے دور میں صنف شاعری کو جو ترقی ہوئی وہ ہر آنے والے عہد کے لئے باعث رشک رہی ہے'' [1]

اسی طرح غالبؔ کے دور میں صرف غالبؔ کی شخصیت ہی آنے والے شعراء کے لئے طرف دار نظر آتی ہے۔غزل بانکپن غالبؔ کی بلند خیالی اور ندرت ادا کا ایک ایسا وسیلہ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور غالبؔ کی تقلید جدید شعرائے اُردو کے لئے اس لئے بھی رہی ہے کہ انھوں نے جدید اور پاکیزہ تشبیہات کو شعری دنیا میں متعارف کروایا اور ان کی پروازِ فکر زندگی کے فلسفہ اور حقائق سے آگئی بخشی [2]

''یگانہؔ چنگیزی جہاں دار افسرؔ کے پسندیدہ شعراء میں سے ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جو چیز یگانہ کو دیگر شعراء میں ممتاز و مفتخر کرتی ہے اُن کا زورِ کلام ہے، بندش کی چُستی کے علاوہ مضامین کے لئے ایسے الفاظ لاتے ہیں جو پوری طرح مفہوم کو ذہن نشین کرادیں اور اُن کے کلام کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ جس سے دلکشی پیدا ہوتی ہے وہ طنز ہے اور یہ عنصر کہیں کہیں اتنا تیز اور تیکھا ہے جو زورِ بیان کا لطف دوبالا کر دیتا ہے'' [3]

جہاں دار افسرؔ کا فانیؔ کے کلام سے متاثر ہونا ایک فطری چیز ہے۔کیونکہ انھوں نے اپنی شعورِ حیات میں جس طرف بھی نگاہ اٹھا کر دیکھی اُن کو ایک زخم خوردہ اور سسکتی ہوئی انسانیت نظر آئی۔مایوسیوں اور محرومیوں کے اس دوراہے پر جہاں دار افسرؔ کے قلبی کیفیات بھی اس پس منظر کی حقیقت سے آشنا رہی ہیں۔لیکن جہاں دار افسرؔ نے فانیؔ کی قنوطیت کو اپنانے کے بجائے فانی کے کلام میں شدّتِ اثر اور معنویت ہے اس کو قبول کیا۔

روایات غزل کی آخری کڑی جگرؔ مرادآبادی بھی جہاں دار افسرؔ کی نگاہوں میں ایک مرشدِ میخانہ کی

حیثیت رکھتے ہیں۔ جگرؔ سے متاثر ہونا اُن کے لئے تعجب کا باعث نہیں جگرؔ کی شاعری دردِ عشق سے عبارت ہے اور اس درد میں حسرتِ بے پایاں کا پہلو بھی شامل نظر آتا ہے۔ اور یہ حسرت کا پہلو تاثیر کے ساتھ وجدانی کیفیت پیدا کرتا ہے اور اس تاثر سے دل پر ایک چوٹ لگتی ہے۔

میرؔ سے جگرؔ تک غزل کی روایات نے جو سفر طے کیا ہے وہ جہاں دار افسرؔ کے مطالعہ میں رہا ہے۔ ایک شاعرانہ بیدار ذہن رکھنے والی شخصیت کے لئے یہ اکتسابِ فن ضروری بھی تھا۔

ایک اندازے کے مطابق (۲۵) پچیس برس کی عمر یعنی ۱۹۵۰ء تک شاید وہ غزل کے پرستار رہے ہوں گے۔ مجھے اس دور کے کلام میں غزل کا روایتی انداز خاصہ نمایاں نظر آتا ہے۔ جہاں دار افسرؔ نے کہیں لکھا ہے کہ شاعری کی دس (۱۰) بیاضیں گم ہوگئی۔ اگر وہ بیاض رہتی تو اُن کے کلام کا تجزیہ کرنے اور غزل کے رجحان کے ذریعہ شاعرانہ مزاج کو سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ یہاں تو مختصر سا شعری مجموعہ ہے جو اُن کے حقائق زندگی، واقعات زندگی، سانحات زندگی، مشاہدات زندگی اور تجربات زندگی کا ایک صحیفہ ہے۔ اور اسی کی روشنی میں جہاں دار افسرؔ کے کلام اور ان کے جذبات دل کی صرف ایک گونہ توضیح ہوسکتی ہے۔ اس شعری مجموعے کے آخری صفحات میں تحریر کردہ غزلوں کے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے ابتدائی کلام میں اس قسم کے اشعار کی بہتات رہی ہوگی جیسا کے وہ کہتے ہیں.

آباد رکھے حُسنِ تصوّر تجھے خدا
ملتے ہیں ہجر میں بھی مزے وصل یار کے

اس قسم کے اشعار یہ جہاں دار افسرؔ کا ابتدائی کلام ہوگا اگر غزل کے ساتھ سنہ اور تاریخ درج ہوتی تو اس کا بخوبی اندازہ ہوتا کے یہ کس دور کا کلام ہے۔ ان اشعار میں صفیؔ کی طرزِ ادا کا رنگ نمایاں ہے۔ دو شعر اسی زمین میں ہے۔

اب کس کو اپنا جانئے کہیئے کسے رفیق
دل اختیار میں ہے نہ وہ اختیار میں

افسر تم اس کی حسن پہ قرباں تو ہو مگر
دو دن خزاں کے ہیں تو ہیں دو دن بہار کے

ان اشعار پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تغزل کا قدیم رنگ لئے ہوئے ہیں۔ اور خود جہاں دار افسر اس بات کے معترف ہیں کہ ''حضرت صفی کا فیض ہے جو شاعر کو خوش بیانی کا سلیقہ عطا کیا''۔ یہ شعر کو دیکھئے جس میں صنعت ردالعجز (علی الصدر) کو برتا گیا ہے۔

پہنچے انساں تو انساں کے دل تک پہلے
بعد کی بات ہے اللہ میاں تک پہنچے

جہاں دار افسر کی کمال سخنوری کا جو حصہ ہے اس سلسلہ میں استاذ سخن صفی اورنگ آبادی میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فیضِ اخلاص و عنایت ہے صفی کا افسر
تم سے شاعر بھی جو اب حسنِ بیاں تک پہنچے

جہاں دار افسر کی ایسی غزلوں میں جو قدیم رنگ لئے ہوئے ہیں۔ زبان و بیان کے لطف کے علاوہ اور ایسے بھی مضامین ملتے ہیں جو اُن کے پیش رو کہہ چکے ہیں لیکن یہ خیال بھی ذہن میں رہے کہ صدیوں سے ہر شاعر گُل و بلبل، شمع و پروانہ، قفس آشیانہ کی بات کرتا آیا ہے لیکن یہی بات ہر شاعر کے پاس بہ اعتبار مضمون نئی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ شعر کو برجستہ انداز میں برتنے کا سلیقہ ہی شعر کے حسن میں چار چاند لگا دیتا ہے شعر میں شاعر جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ ایک لحاظ سے نگینہ کی طرح جڑا ہوتا ہے۔ اگر اس کے بجائے اس کا مترادف بھی استعمال کیا جائے تو شعر داد حاصل نہیں کرسکتا۔ غائر نظر سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شعر میں مناسب لفظوں کے استعمال سے دل کے جذبات کا کھلے طور پر اظہار ہوتا ہے۔

شعر میں جو بھی لفظ استعمال ہوتا ہے اس سے 'آرزو' 'تمنا' 'تڑپ' 'التماس' 'التجا' اضطراری و بیقراری کی کیفیات کا ظاہر ہونا ایک عین حقیقت کے مماثل ہے۔ اگر اس کو حسن سلیقہ سے برتا جائے تو شعر از خود دل میں تیر بن کر پیوست ہوجاتا ہے۔ چاہے شعر میں لفظوں کی شان و شوکت کیوں نہ ہو وہ بسا اوقات بے معنی

ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک سادہ سیدھا شعر کہیں قاری کے ذہن پر اپنے گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ شعر میں لفظوں کا اس انداز سے استعمال صرف اساتذہ سخن کی صحبت یا اُن کی اصلاح کا نتیجہ ہوتے ہیں یا گہرے مطالعہ سخن سے شاعر اس انداز کے شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے۔ حسن اظہار کا قرینہ جب فکر کی منازل طے کر کے بے ساختہ زباں پر آجاتا ہے تو ایسا شاعر قادرالکلامی کے شرف کا مستحق قرار پاتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان اپنی معرکتہ آلارا کتاب '' اُردو غزل '' میں یوں رقم طراز ہیں۔

'' قادرالکلام شاعر لفظوں کو فاتحانہ انداز میں برتتا ہے اگر وہ کبھی ایسے مضمون کو پیش کرنا چاہتا ہے جسے اس کے پیش رو پہلے برت چکے ہیں تو باوجود اس کے وہ اپنی شخصیت کے اثر سے اور حسن اُدا سے۔ اس میں تازگی اور ندرت پیدا کردے گا۔ کوئی لفظ اور کوئی مضمون محض پہلے برتے جانے سے فرسودا نہیں ہوتا اچھا شاعر اپنے نفس گرم سے مضمحل اور مردہ لفظوں میں بھی نئی روح پھونک دیتا ہے۔ غزل گو شاعر کے لئے لفظ محض علامتیں ہیں۔ جو ذہن کی حقیقت کی طرف منتقل کرتی ہیں تغزل کا یہی طلسم باا عجاز ہے جو اس صنف سخن کو ہمیشہ باقی رکھے گا. اور جو شاعر اس قسم کا جادو جگا سکے گا اس کو اُستادی کا فخر نصیب ہوگا۔ کوئی مضمون کسی شاعر کی ملکیت نہیں ہوجاتا وہ اُس کا ہوجاتا ہے جو اُس کو اچھی طرح برت سکے اس بات میں۔ ''

تقدم و تاخر کوئی معنی نہیں رکھتا کسی شاعر نے کسی مضمون کو پہلے برتا اور دوسرے شاعر نے کچھ عرصہ بعد باندھا اور وہ اپنے پیش رو کے مقابل میں اس کو زیادہ بلند کردیا۔ یا اس میں کوئی ندرت پیدا کردی تو وہ مضمون اس کا ہوجائے گا [۵]

رضی الدین حسن کیفی کا ایک شعر ہے۔

ایسے آنے سے تو نہ آنا تھا
آتے ہی تذکرہ ہے جانے کا

اور جہاں دار افسرؔ نے اس مضمون کو باندھا ہے مگر بڑے سلیقہ سے شعر ہے

آنا ایسا کیا آنا ہے
آئے بھی تو جانے آئے

جیسا کے پہلے کہا جا چکا ہے بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں کوئی لفظ اور کوئی مضمون پہلے برتے جانے پر فرسودہ نہیں ہوجاتا اچھا شاعر اپنے نفس گرم سے مضمحل اور مردہ لفظوں میں بھی نئی روح پھونک دیتا ہے۔اب ان دو شعروں پر غور کیجئے کیفی کے شعر میں مخاطب محبوب یا اور کوئی شخص ہوسکتا ہے۔اس کے علاوہ روزمرّہ بول چال میں اس کی برجستگی بھی خوب ہے۔اس کے برخلاف معنویت کا لحاظ کرتے ہوئے جہاں دار افسرؔ کا شعر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔شعر میں حزن وملال اور حسرت کی چاشنی موجود ہے۔علاوہ ازیں انسانی زندگی کے مختصر سے عرصہ کا اظہار بھی پوشیدہ ہے۔انسان اس دوروزہ دنیا میں چند لمحوں کے لئے آتا ہے اور اس دنیا سے پھر چپ چاپ چلا جاتا ہے۔اُس کی حسرتیں اس کی آرزوئیں اُس کی تمنّائیں بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہوجاتی ہیں۔اور شاعر کفِ افسوس ملتے ہوئے کہتا ہے ع

آئے بھی تو جانے آئے ۔ع

یہ شعر سادہ الفاظ رکھنے کے باوجود قابل تحسین ہے

# ردیف نگاری

جہاں دارافسؔر کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بعض غزلیں ایسی بھی کہی ہیں جس میں خاص طور پر ردیفوں پر توجہ دی گئی ہے۔اس اہتمام سے لفظی اور معنوی حسن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے مثال کے طور پر چند غزلوں کی ردیفیں یہاں پیش کی جاتی ہیں اس شعری مجموعے کے صفحہ (۸۳) پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

تمنّا' آس' حسرت آرزوٗ ارمان بکتے ہیں
یہ سب کیا چیز ہیں اس دور میں ایمان بکتے ہیں

عصر حاضر کے بگڑے ہوئے معاشرے کا خوب جائزہ لیا ہے۔اس غزل میں قافیہ' ایمان' انسان ارمان وغیرہ میں اور ردیف بکتے ہیں۔اور قافیہ کا دارومدار ردیف بکتے ہیں' پر منحصر ہے

وہ تیرگی ہے کہ اب روشنی بھی زخمی ہے
فروغ جہل سے دانشوری بھی زخمی ہے

اور ردیف سے بہتر انداز میں مضمون آفرینی کی ہے۔غزلیات پر تفصیلی بحث آئندہ اوراق میں ہوگی۔یہاں صرف جہاں دارافسؔر کی ردیف نگاری کا جائزہ لیا جائیگا۔اس طرح صفحہ (۹۰) پر غزل کا مطلع ہے۔

اس غزل میں ردیف ''زخمی ہے'' مختلف مقامات پر مختلف موضوعات کے ساتھ ہمارے مطالعہ میں آتی ہے۔ردیف کا لفظ ''بھی'' زور بیاں پر دلالت کرتا ہے۔اور زخمی ہے کا مفہوم بلحاظ قافیہ کہیں روشنی کی قلّت کو ظاہر کرتا ہے کہیں زخمی کا مفہوم زندگی کے ساتھ زندگی کی بے مائیگی کا پتہ دیتا ہے کہیں تشنگی کے ساتھ زخمی کا مفہوم انتہائی پیاس کو ظاہر کرتا ہے کہیں خاموشی کے لئے گونگے پن کو ظاہر کرتا ہے اور کہیں کلی کلی کا زخمی ہونا جشن بہاراں کے منظر کو پیش کرتا ہے۔جہاں دارافسؔر نے اس ردیف کے ساتھ اپنے کمال سخنوری کے جوہر دکھائے ہیں۔اس سے اُن کے فن شعر پر قادرالکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔

صفحہ (۹۳) پر غزل کے پانچ شعر ہیں جس میں ''دروازہ'' ردیف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور اس دروازے سے مختلف مضامین اپنی آب وتاب کے ساتھ آتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

کہیں یہ بار نہ ہو جائے طبعِ نازک پر
نہ کھٹکھٹا یا کرو بار بار دروازہ
ہوا سے ہلتی ہے زنجیر میرے دل کی طرح
ہے میرے درد کا آئینہ دار دروازہ
ہم اپنے گھر میں ہیں مدفون بے کسی افسرؔ
بنا ہوا ہے نشانِ مزار دروازہ

صفحہ (۹۵) پر غزل ہے جس کے قافیہ۔ گہر' نظر' سفر' اور ردیف سلامت استعمال کی گئی ہے۔ اس غزل کا مطلع ہے۔

بہار حسن چمن سلامت' فروغِ لعل و گہر سلامت
ہزار جلوے ہیں ہر قدم پر' اگر ہو ذوقِ نظر سلامت

اس غزل میں ردیف کے توسط سے معنیٰ ومفہوم کو بڑی سادگی اور سلاست سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صفحہ (۹۶) پر غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

ہر ایک سمت سے پتھر ہے آپ ساتھ رہیں
حیات آئینہ پیکر ہے آپ ساتھ رہیں

اس غزل میں قافیے۔ پتھر' پیکر' سمندر وغیرہ استعمال کئے گئے ہیں اور ''آپ ساتھ رہیں'' ردیف کے ساتھ قافیوں کا مفہوم میں کہیں نزاکت' ہمت وجرات حادثوں سے نبرد آزمائی کہیں تنہائی اور فراق سے عبارت ہیں اس طرح شاعر نے ردیف کے توسط سے اپنے دل کی بات کہی ہے۔

حریف ذوق سفر بن رہی ہیں خود راہیں
عجیب موڑ پہ افسرؔ ہے آپ ساتھ رہیں

صفحہ (۹۷) پر غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

رُکے ہمارے قدم یا ٹھہر گئی تاریخ
فریب جاگا حقائق کی مرگئی تاریخ

اس غزل میں ردیف ''تاریخ'' کو مختلف پیرائے میں برتا گیا ہے۔ص (۹۸) پر غزل کی ردیف چراغ اور قافیہ زندگی، اور رہبری وغیرہ ہیں ''چراغ'' کے مفہوم کو پیش نظر رکھ کر شاعر نے جو مضامین کو اپنایا ہے۔اس سے ایک وسعت پیدا ہوگئی ہے جس سے فلسفہ وحیات کی نیرنگیاں بکھرتی ہوئی دیکھائی دیتی ہیں جہاں ہزار امیدوں کے چراغ جھلملاتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

سفر ہے شرط، اجالوں کی کیا کمی افسرؔ
قدم قدم پہ فروزاں ہیں زندگی کے چراغ

صفحہ (۹۹) پر جہاں دار افسرؔ نے ایک غزل لکھی ہے جس کا قافیہ چھاؤں. گاؤں اور ردیف ''بہت تیز دھوپ ہے'' ہے ''بہت تیز دھوپ ہے'' میں کہیں زمانے کی تلخی کا اظہار ہے، کہیں پر انتظار کی کیفیت کا اظہار ہے، اور کہیں پر اپنی بے کسی و بے بسی کی طرف اشارہ ہے اور کہیں عشق کی بیتابیوں کا ذکر ہے۔اور کہیں رحمت کی طلب گاری کی بے پناہ آرزو غرض یہ کہ جہاں دار افسرؔ اس غزل میں ایک سکون بے پایاں کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ اس غزل کا مقطع ملاحظہ کیجئے۔

افسرؔ پہ ڈال اے تنِ بے سایہ اک ذرا
دامن کی اپنے چھاؤں بہت تیز دھوپ ہے

ص (۱۰۵) پر غزل ہے مطلع ۔

ہے جلوۂ جمال سحر کم بہت ہی کم
یا ہو گیا شعور نظر کم بہت ہی کم

ردیف کم بہت ہی کم کا پیمانہ، فکر ونظر کی اساس پر، قافیے، سحر، نظر، سفر اور راہ گزر کے ساتھ بڑی خوبی سے برتا گیا ہے۔

صفحہ (١٠٩) پر غزل ہے جسکی ردیف ''تلاش کرتے ہیں'' استعمال کی گئی ہے۔ اس ردیف کی معرفت جہاں دارا فسر نے مختلف انداز سے حقائق زندگی کی جستجو کی ہے۔ کہیں پر حسن، کہیں پر عزم محکم، کہیں پر کیف ومستی، کہیں پر منزل مقصود، کہیں پر ٹوٹا ہوا دل کہیں پر اظہار عشق سے دل کی دنیا کو آباد رکھنے کی کوشش۔ صرف ''ردیف تلاش کرتے ہیں'' کی مرہون منت ہے جو غزل کی کامیابی کی ضامن ہے اس غزل کا پسندیدہ شعر یہ ہے۔

کبھی کسی نے پکارا تھا نرم لہجے میں
ہم آج تک وہی لہجہ تلاش کرتے ہیں

صفحہ (١١٣) پر غزل کا مطلع ہے۔

ہے صدائے تشنہ لب یوں پیاس کی دہلیز پر
جیسے دستک دے کوئی احساس کی دہلیز پر

اس غزل میں قافیے پیاس، احساس، آس وغیرہ استعمال کیے گئے ہیں۔ ردیف کے ذریعہ مفاہیم کو بڑی خوبی سے واضح کرنے کی کوشش قابل داد ہے۔ اس غزل میں حسرت ویاس، اور عزت و نفس کی بات بڑی خوبی سے ادا کی گئی ہے۔ پسندیدہ شعر حسب ذیل ہیں۔

ہم نے کتنی مشکلوں سے راستوں کو طے کیا
دم اکھڑتا ہے مگر افلاس کی دہلیز پر

یاس کی چوکھٹ سے ٹکرایا ہوا زخمی ضمیر
پھر بھی در ماندہ کھڑا ہے آس کی دہلیز پر

میری کوئی سانس اُن کی یاد سے خالی نہیں
دم بھی ٹوٹے گا تو پاس انفاس کی دہلیز پر

صفحہ(۱۱۹) پر غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

کیوں نہ ہو محبوب اپنا مشغلہ آوارگی
دے رہی ہے کس کی محفل سے صدا آوارگی

آوارگی کے لغوی معنی تو پراگندی، آشفتگی اور ابتری کے ہوتے ہیں لیکن شاعر نے اس مفہوم کو دیگر معنوں میں وسعت دی ہے اس لحاظ سے غزل کئی احساسات قلبی کا احاطہ کرتی ہے۔ جس میں کہیں مرحلہ عشق کی سرگردانی ہے کہیں جذبہ شوق کی فراوانی ہے۔ اور کہیں معرفت حق کی جستجو میں جانثاری اور کہیں وحشتِ دل کی اضطرابی کیفیت ہے۔ اور کہیں شانِ قلندری پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جہاں دار افسرؔ کہتے ہیں۔

ریت کی گرمی، صلیبی نوک، پیالا زہر کا
کتنی صاحب منزلت ہے اے خدا آوارگی

اس شعر میں دیکھئے اصوات کی تکرار سے شعر میں حسن پیدا کیا گیا ہے۔

بھرتے بھرتے بھر نہ جائیں زخم اُن کی یاد کے
رفتہ رفتہ ہو نہ جائے بے مزا آوارگی

بھرتے بھرتے، رفتہ رفتہ۔ شعر میں خارجی طور پر یہ تکرار موسیقیت و غنائیت کے لئے اہمیت رکھتی ہے الغرض جہاں دار افسرؔ کی ردیف نگاری اُن کی شاعری میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ قدیم شعراء کے ہاں ردیف نگاری میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جو کسی معرکہ کا حصہ رہی ہیں۔ بعض اوقات مضحکہ خیز ردیفیں جیسے لنگور کی گردن، انگور کی گردن وغیرہ وغیرہ۔ اور مضحکہ خیز قافیوں سے بھی گریز نہیں کیا۔ لیکن اب وہ زمانہ اور وہ معرکے نہیں رہے پھر بھی لوگ تفنن طبع کے لئے آجکل اس قسم کی ردیفوں سے کام لیتے ہیں جس سے خیال تو مجروح ہو جاتا ہے اور تضیع اوقات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ زبان و بیان کے چٹخارے لینا تو الگ بات ہے۔ لیکن جہاں دار افسرؔ کی ردیف نگاری کا تعلق ہے اُنھوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے اور ردیفوں کو ایک اعلیٰ مقصد اور معنی و مفہوم

کی گہرائی کے لئے بڑی عمدگی سے استعمال کرنے کی کوشش ہے۔

## تراکیب لفظی

جہاں دارافسرؔ نے اپنی غزلیات میں لفظی تراکیب کا بھی خاص خیال رکھا ہے غزل کا ظاہری حسن تو یہی ہے جو بات کہی جائے وہ مختصر لفظوں میں ہو اس سے غزل میں تاثیر کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں۔ لفظی تراکیب میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ معنویت سموئی جاسکتی ہے۔ اور لفظی تراکیب کے اشارے بعض وقت شرح طلب بھی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ شخصیت کے کردار و صفات کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ جو بات کسی شخصیت کے تعلق سے صفحات میں کہی جاسکتی ہے وہ ایک لفظی ترکیب کے توسط سے صرف دو لفظوں میں کہی جاتی ہے تو لطف بیان میں ایک نازک لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان لفظی ترکیبوں سے جہاں دارافسرؔ کی شعری خصوصیات میں رمزیت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً نظم ''دعائے نیم شبی'' میں وہ یوں مخاطب ہیں

اے قندیل حکمت

اے رحمت سراپا

مجھے تیرگی سے بچالے

انھوں نے یہاں تیرگی کے لئے قندیل حکمت کی لفظی ترکیب بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے رحمت سراپا کی لفظی ترکیب سے ذہن خود بخود محسن انسانیت آقائے دو عالم ﷺ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جہاں دارافسرؔ نے ''یخ بستہ'' کے عنوان سے (ایک دوست کے مفلوج ہو جانے سے متاثر ہو کر) نہ بھی لکھتے تو پوری نظم پڑھنے کے بعد مفہوم سے آگہی ہو جاتی ہے۔

ایک جگہ جہاں دارافسرؔ نے اپنی غزل کے ایک شعر میں ''اعتبار آدمیت'' کی لفظی ترکیب کو استعمال کر کے آدمی کی کم مائیگی کا احساس دلایا ہے اس کو ایک حساس دل ہی محسوس کر سکتا ہے۔

کس قدر نایاب ہے اس دور میں
اعتبار آدمیت کیا کہیں

انسانی فطرت کا تقاضہ یہ رہا ہے کہ زندگی سراپا غم ہونے باوجود اگر اس کو کسی خوشگوار واقعہ یا منظر سے سابقہ پڑ جائے تو یہ لمحہ بھر کی انبساطی کیفیت اُسکے لئے ایک گونہ تسلی اور سکون کا باعث ہوتی ہے۔ جہاں دار افسرؔ نے اپنے ایک شعر میں تلخی ایاّم کی لفظی ترکیب کو استعمال کر کے معنوی خوبیوں کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ شعر ایک لحاظ سے ذومعنی کیفیت کا حامل ہے۔ شعر ہے

شہد ٹپکا تلخی ایاّم سے
اُن کے لہجے کی حلاوت کیا کہیں

شعر کے انفرادی مفہوم ہی لیا جا سکتا ہے کہ شاعر محبوب کی گفتگو سے متاثر ہو کر اپنی تمام مشکلات کو یکسر بھول جاتا ہے۔

اس کو اپنے مصائب زدہ ایام کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اگر اس کو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس شعر کا یہ مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں ایسی ہستیاں بھی موجود ہیں جو اپنے لہجے کی مٹھاس اور نرمی سے زندگی کے غموں سے چھٹکارا پانے یا مفر حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور وہ زمانے کی کڑواہٹ مٹھاس سے بدل دیتے ہیں۔ ہزار مشکلوں میں مسکرانا اُن کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے۔ اس شعر میں علامتی لفظ بھی اپنی خوبی کا اظہار کرتا ہے۔ شہد علامت ہے خوشگوار لمحات کی اور ''تلخی ایاّم'' زندگی کے مصائب و آلام کی طرف کھلا اشارہ ہے۔ اور ''لہجے'' میں زندگی کے اتار چڑھاؤ کی کیفیت پوشیدہ ہے اور حلاوت زندگی کے خوشگوار یادوں کے پس منظر کا نام ہے. یہ شعر لفظی و معنوی خوبیوں کا امتزاج رکھتا ہے۔ اسی طرح جہاں دار افسرؔ نے زندگی کی قدر و قیمت اور اُسکی اہمیت کو ظاہر کرنے کیلئے صرف ایک ایسی لفظی ترکیب '' سایۂ افلاس'' کو کام میں لاتے ہیں جس سے زندگی کی اہمیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ مزید تفصیل کے بغیر شعر سُن لیجئے ؎

سایۂ افلاس میں بھی زندگی
کیوں ہے افسرؔ خوبصورت کیا کہیں

ایک جگہ جہاں دار افسرؔ نے اپنے درونِ غم سے ناواقفیت کے اظہار کو "ادائے شیوۂ چارہ گری" کی لفظی ترکیب کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

ہمارے زخم کی گہرائی کون دیکھے گا
ادائے شیوۂ چارہ گری بھی زخمی ہے

مزید وضاحت کی بغیر لفظی تراکیب کے اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

تیغِ ہوس۔

چلی ہے تیغِ ہوس ہائے کس سلیقے سے
خیال و فکر کی شائستگی بھی زخمی ہے

مدفونِ بے کسی۔

ہم اپنے گھر میں ہیں مدفون بے کسی افسرؔ
بنا ہوا ہے نشانِ مزار دروازہ

ہمہ رنگ کی بہار پھولوں کے لئے فروغ لعل و گہر کی ترکیب۔

بہارِ حسن چمن سلامت' فروغ لعل و گہر سلامت
ہزار جلوے ہیں ہر قدم پر اگر ہو ذوقِ نظر سلامت

قحط شیوۂ اظہار۔

یہ قحطِ شیوۂ اظہار ہے کہ محفل میں
زباں کا ذکر ہی کیا خاموشی بھی زخمی ہے

راہ نور و دیار ارماں۔

میں ایک راہ نورو دیار ارماں ہوں
یہ راستہ ہی مرا گھر ہے آپ ساتھ رہیں

حریفِ ذوق سفر ؎

حریف ذوق سفر بن رہی ہیں راہیں
عجب موڑ پہ افسرؔ ہے آپ ساتھ رہیں

دلِ طوفاں شکن ؎

سب کو نصیب یہ دل طوفاں شکن کہاں
اعزاز ایسا ملتا ہے افسرؔ نصیب سے

دلِ خوں گشتہ ؎

دلِ خوں گشتہ کا غم سے کوئی رشتہ نہ رہا
زندگی کیا تراہم سے کوئی رشتہ نہ رہا

غرض یہ کہ جہاں دار افسرؔ نے اپنے ترکیبی لفظیات سے شعری محاسن میں ندرت پیدا کی ہے۔

## مزاجِ شعر

غزل میں رنگینی، رعنائی اور وارفتگی کا عالم جوش جذبات اور قلبی تاثرات سے پیدا ہوتا ہے۔ جہاں دار افسرؔ کی بیشتر موضوعات ایسی ہی تمام خصوصیات کے ساتھ موجود ہیں۔ حسن و عشق کی کیفیات، درد و غم کا شدید احساس، سوز و گداز کی فراوانی، زندگی کا فلسفہ، انسانی مسائل پر گفتگو اور سماجی تصورات کو اپنے طور پر بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔ اسکے علاوہ فنّی نقطہ نگاہ سے لفظیات کا مناسب استعمال، معنوی خوبیاں، بندش شعر بحروں کا انتخاب اور موسیقی میں رچی ہوئی غزلیں اُن کے مزاج شعری کا پتہ دیتی ہے۔ اُن کے والہانہ کلام کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اُن کی شعری حسّیت، اُن کے خارجی اور داخلی کیفیات سے معرض وجود میں آئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن کے سینہ میں ایک دردمند دل ہے اس کے دھڑکنے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اُن کے کلام میں احتراق انگیزی تو نہیں ہے لیکن ایک ایسی سلگتی ہوئی چنگاری اُن کے جذبات دل سے وابستہ ہے جو ذرا سی ہوا لگنے

پر خرمنِ دل کو جلا دینے کے لئے کافی ہے۔ بعض مقامات پر اُن کا غم فکر کی منزلیں طے کر کے میرؔ فانیؔ اور جگرؔ کے فیضِ غم سے منسلک ہو جاتا ہے۔ بازگشت اپر تاثر میں جناب ایس اے رؤف نے جہاں دار افسرؔ کی شاعری کے تعلق سے ایک اجمالی خاکہ پیش کیا ہے جس کا اظہار شعری بحث کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے وہ رقم طراز ہیں۔

''جہاں دار افسرؔ دبستانِ صفیؔ کے ایک قدر آور شاعر ہیں اور ان دردمندوں میں ایک باعزت مقام رکھتے ہیں۔ جو سحر تک شمع کے ساتھ روتے اور موم کی طرح پگھلتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی آنکھوں میں عوام کی آنکھیں جذب کرلی ہیں اور وہی خواب دیکھتے ہیں جو عام آدمی کے خواب ہیں وہ اس زندگی کے ترجمان ہیں جو انتظار' آرزوٗ تڑپ تسکین سے عبارت ہے۔ انتظار ایک نئے سویرے کے گجر بجنے کا' آرزو اُسکی کہ ایک نئی صبح کا نام دل کی دہلیز پر چمکے، تڑپ یہ کہ منظر پر افگندہ نقاب آئے تاکہ پیار سے سجدوں کا ارمان نکلے اور تسکین یہ کہ خود کو عالمی برادری کا ذہنی رشتہ دار بنالیا ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار کی پاسداری' حریت پسندی اور جمہوری پیش رفت کے لئے اپنے حالات کے مطابق مصروف جہاد ہے۔ تاکہ دنیا سے رنگ و نسل مذہب و فرقہ کی تنگ نظری کے اندھیرے مٹ جائیں اور سماجی انصاف سب کا مقدر بن جائے۔'' اُن کی شاعری میں بھی معشوق ہے لیکن وہ نہ تو اپنے معشوق کے ہجر میں تڑپتے ہیں۔ اور نہ تارے گن گن کر سحر کرتے ہیں۔ بلکہ راہ وصل کی معاشی دشواریوں اور سماجی مجبوریوں کا حل تلاش کرتے ہیں اپنی راتیں کاٹتے ہیں اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ جدوجہد کرنے لگ جاتے ہیں. وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور معرا نظمیں اور دونوں میں مسرت کی چمک بھی اور مسرت کی دمک بھی [6]

**جائزہ** : اس میں جہاں دار افسرؔ کے خیالات کے پس منظر میں اُن کے نظموں اور غزلوں میں جو احساس کارفرما ہے اس کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس سے اُن کے نظریات شعری میں مدد لی جاسکتی ہے۔

یعنی اُن کا نظریہ شعری اس بات کا متقاضی رہا ہے کہ اپنے ماحول اور گردو پیش کے حالات سے ہر انسان کو باخبر رکھا جائے. اور ان کی شاعری کا اہم مقصد یہی رہا ہے کہ ایک آدمی کو اسکی مجبوریوں سے آزاد کیا جائے. اور ایک انسان کو انسانیت کا درس دے کر اسکے صحیح مقام کا تعین کیا جائے ایک لحاظ سے اُن کی شاعری میں اصلاحی تحریک کارفرما رہی ہے۔ اسکے باوجود اُن کی شاعری کا عمیق نگاہی سے مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اُن کے جذبات کا رنگ ایک لحاظ سے انفرادی خصوصیت کا بھی حامل رہا ہے وہ اس آئینہ میں اپنے درد وغم کی ایک ایسی تصویر اور جذبات کا عکس پیش کرتے ہیں جس سے قاری کے ذہن میں زندگی کی تصویر کا ایک ایسا بھی رُخ ہے جب نگاہوں میں حسرت ویاس کے رنگ بکھیر دیتا ہے. جہاں دار افسرؔ کے کلام میں اُن کی زندگی کے مختلف جذبات اور رنگ کا سیر حاصل جائزہ لیں سب سے پہلے جہاں دار افسرؔ کے نظریہ حسن سے بات کا آغاز کرتے ہیں۔

**نظریہ حسن:** حُسن ایک ایسی کشش کا نام ہے جس میں عقل انسانی پر محویت اور بے خودی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور وادیٔ دل میں عشق و محبت کے جذبات شعلہ بن کر بھڑک اٹھتے ہیں ۔اس وارفتگی میں انسان مختلف ادوار سے جب گزرتا ہے تو اس کے دل میں حسرت' ارمان' آرزو' تڑپ اور تسکین سامان خو بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی غم واندوہ سے ہمکنار رہتا ہے تو کبھی انبساط وخوشی کے لہروں میں بہتا چلا جاتا ہے. اگر وہ حسن کے زیر اثر کسی سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کے دل کے جذبات میں ہمہ رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص شاعرانہ دل ودماغ رکھتا ہے تو اس کے لئے حسن کی دنیا بہت وسیع ہو جاتی ہے۔ حُسن کسی مادی شئے میں رنگ ونور کے بکھیرنے کا ہی نام نہیں حسن ایک ایسی لطافتِ شائستگی کا بھی نام ہے جو صرف محسوس کی جاسکتی ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا حسن تو یہی ہے کہ انسان کے دل میں ہزار غم ہونے کے باوجود زندہ رہنے کی خواہش ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ چنانچہ جہاں دار افسرؔ زندگی کے اِس حسن کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

سایہ افلاس میں بھی زندگی
کیوں ہے افسرؔ خوبصورت کیا کہیں

اس شعر میں استفہامی انداز بھی شعر کے حسن کی دلیل ہے۔

حُسن کی لطافتیں مختلف انداز سے شاعر کے ذہن و دل کو متاثر کرتی ہیں۔ شاعر کے نزدیک کبھی محبوب کے لب و لہجے میں ناقابل فراموش حسن کی لطافتیں محسوس ہوتی ہیں۔ کبھی انداز گفتگو میں قندو نبات کے مزے لوٹتا ہے۔ کبھی حدیث دلبراں میں گل افشانی کے منظر دکھائی پڑتے ہیں۔ چند شعر اسی انداز حسن کے غماز ہیں ۔

شہد ٹپکا تلخی ایّام سے
اُن کے لہجے کی حلاوت کیا کہیں
کبھی کسی نے پکارا تھا نرم لہجے میں
آج تک وہی لہجہ تلاش کرتے ہیں
انداز گفتگو ہے کہ قندو نبات ہے
اس گلبدن کی بات پھولوں کی بات ہے

حسن کی تجلیات کا نظارہ کرنے کے لئے آنکھ چاہیئے۔ کور باطن کے لئے قدرت کے نظارے بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ دید لیلیٰ کے لئے مجنوں کا دیدہ چاہیئے کے مصداق حسن کی دنیا میں ہزار نیرنگیاں پائی جاتی ہیں جب کہ جوہر شناس نگاہ میسر ہو اور ایسی جوہر شناسی صرف ذوقِ نظر کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ جہاں دار افسر کہتے ہیں ۔

بہارِ حُسن چمن سلامت، فروغِ لعل و گہر سلامت
ہزار جلوے ہیں ہر قدم پر اگر ہو ذوق نظر سلامت

آنکھ والے کے لئے سادگی میں بھی ایک حسن کی دنیا آباد نظر آتی ہے۔ جہاں دار افسر اس اظہار کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے ۔

وہاں کسی کا بھلا رنگ و نور کیا کھلتا
جلائے تم نے جہاں اپنی سادگی کے چراغ

حسن آنکھوں کی ٹھنڈک دل کا سکون ہوتا ہے۔ حُسن رحمتِ یزداں کا ایک بے کراں سایہ ہے۔ حسن کی چھاؤں دائمی آسودگی کا حاصل ہوتی ہے۔ جہاں دار افسرؔ کی فکر و نظر میں ایسی ہی لازوال رحمت کا حسن موجود ہے جس کی عطا زندگی کے لئے دائمی آسودگی کا باعث ہو سکتی ہے۔ زندگی کی یہ تڑپ اک دعا کی صورت میں شاعر کے لبوں تک یوں آتی ہے۔

افسرؔ پہ ڈال اے تنِ بے سایہ اک ذرا
دامن کی اپنے چھاؤں بہت تیز دھوپ ہے

چند شعر اسی تاثرِ حُسن کی اساس پر مختلف موضوعات پر پیش ہیں۔

۱۔ حسن اخلاص ۔

دل میں جب چاہے شوق سے آ جا
دل مرا مخلصوں کی وادی ہے

۲۔ حسن وضع داری ۔

افسرؔ خوش نوا کی عمرِ دراز
وضع کا ایک آدمی ہے میاں

۳۔ تصرف حسن ۔

پرتو خورشید سے ذرّوں میں آتی ہے چمک
خاص آتے ہیں عوام الناس کی دہلیز پر

۴۔ عظمت حسن ۔

ترے جلوؤں کی فراوانی میں کھو جاتا ہوں
اب مرا دیر و حرم سے کوئی رشتہ نہ رہا

۵۔ تصورِ حُسن ۔

بدلتا جاتا ہے منظر ہر اک نظارے کا
الٰہی کون تصور میں آنے والا ہے

۶۔خرامِ حُسن ؎

نگاہیں مری فرش راہ بن رہی ہیں
یہ کون آرہا ہے خراماں خراماں

**ماہیت عشق:** دل میں سوز وگداز کی کیفیت اُسی وقت حاصل ہوتی ہے جب دل میں عشق کی چنگاری چٹک رہی ہو۔ چاہے وہ عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی. اگر قلب میں عشق کی تو رانیت موجود ہو تو زندگی میں جذبوں کی کیفیات مختلف نوعیتوں سے ظہور پزیر ہوتی ہیں۔ عشق کے اظہار سے حسن کی حقیقت آشکار ہوتی ہے اگر عشق کی حرارت انسان کے دل کو نہ گرماتی تو اس قلب کی 'حیثیت صرف گوشت کے ایک لوتھڑے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ جس طرح حواس خمسہ سے دیکھنے سونگھنے' چکھنے' بولنے اور چھونے کا احساس ہوتا ہے۔ دل میں عشق کی صفات اسی طور اثر انداز ہوتی ہیں۔ جس سے بصیرت حاصل ہوتی ہے اور بصیرت زندگی میں مختلف کیفیات اور جذبات کے ساتھ زندگی سے اپنا رشتہ برقرار رکھتی ہے اور اسی رشتے کی استواری سے انسان درد وغم میں بھی خوشی اور انبساط کے مزے لوٹنے لگتا ہے۔ کبھی حسرت و یاس' آرزو' تڑپ میں تسکین اور راحت کے سامان پیدا کر لیتا ہے یہ صفت عشق کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ جب عشق کی سرشاری زندگی میں سرایت کر جاتی ہے تو ایسی وسعتِ نگاہ حاصل ہوتی ہے تو عاشق کثافت میں بھی لطافت کے جوہر تلاش کرتا ہے۔ اور باطل میں بھی حق کو تلاش کرتا ہے اور تمیز عشق اسی وقت حاصل ہوتی ہے. جب اُس میں صداقت ہو. اور صداقت ہو تو ہمت اپنا کام کر جاتی ہے۔ وفورِ غم' والہانہ شیفتگی جنون شوق اسی صداقت نما ہمت کے دوسرے نام ہیں۔ عشق بظاہر دیوانگی کا نام ہے لیکن اہل حق کی نظر میں یہ فرزانگی ہے، خرد کو روشنی صرف عشق کے ذریعہ ہی حاصل ہوتی ہے۔ خرد کی صرف اتنی حقیقت ہے کہ وہ زندگی کی شاہراہوں میں بے راہ روی کی پگڈنڈیوں سے ہٹ کر چلتی ہے۔ خارزاروں میں دامن سمٹ کر چلتی ہے۔ منزل مقصود کے لئے صرف ایک ہی سمت کو اختیار کرتی ہے۔ مگر عشق کی صداقت جنوں پرور ہوتی ہے اور تکلفات سے بری اور وہ صرف ایک جست' ایک لمحہ' اس کے لئے کار آمد ہوتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی (اقبالؔ)

اس لئے عشق اپنے لئے کوئی حد مقرر نہیں کرتا وہ زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے، عشق میں زندگی کی ایک ایسی صداقت ہوتی ہے جس میں اخلاص کا ایک دریاء موجزن نظر آتا ہے۔ اور اخلاص ہی کے ذریعہ عشق کو معراج نصیب ہوتی ہے۔ جہاں دار افسرؔ اسی صداقت کو فکری اساس پر پر رکھا ہے۔ اور اخلاق عشق کی اس معراج کو حاصل کرنے کے لئے اپنے خیال کو اس انداز سے شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ یہ خیال ہی وہ سلگتا ہوا احساس ہے جوانی کے دل کو عشق کی حرارت بخشتا ہے۔

جذبہ عشق کی حرارت وہی ہے کہ جسے
رسن و دار سے پروانہ توثیق ملے

عشق میں ثابت قدمی، حق رسائی کا ذریعہ ہوتی ہے اور حق رسائی کے لئے صداقت کی منزلوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جہاں دار افسرؔ نے اس خیال کو یوں ظاہر کیا ہے

صلیب و دار کی حد سے گذر کر
صداقت کی علامت بن گیا ہوں

جنوں حقیقت عشق کا ایک معتبر نام ہے۔ جنوں ایک ایسی وارفتگی ہے جو صفات عشق کو مزاج بخشتا ہے یہ جنوں ہی کی کرامت ہے کہ عاشق اپنی ہستی سے بے خبر ہو کر دو عالم کی خبر رکھتا ہے جہاں عقل بہری اور گونگی ہو جاتی ہے جہاں دار افسرؔ کہتے ہیں۔

وہ جنوں لائق تحسین ہے اے اہل خرد
جو جنوں واقفِ اسرار جہاں ہوتا ہے

جنون عشق کی یہ منزل بھی دیکھئے جہاں خود شناسی فریب منزل ہے اور خود فراموشی حصول منزل۔

ہمارا حشر بھی منصور و سرمد کی طرح ہوگا
اگر حق میں ہمارے خود شناسی کا مقام آیا

**شعورغم** : انسان کی لئے غم کے جذبات اس لئے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کہ اس سے شعور حیات میں

پختگی پیدا ہوتی ہے۔ غم حوصلہ مند انسان کے لئے زندگی کو سنوارنے کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے ایک حوصلہ مند انسان مصائب و تکالیف میں رہتے ہوئے غم پر فتح پانے کی کوشش کرتا ہے۔ حوصلہ مند دل مستقل مزاجی کے جوہر کو اور جلا بخشتا ہے۔ جب کسی انسان کو غم سے سابقہ پڑتا ہے تو اسکو اپنے پرائے میں فرق اور کھرے کھوٹے کا احساس بھی ہو جاتا ہے۔ دوست و دشمن میں تمیز کرنا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں رہتا۔ یہ تو ایک عام انسان کے جذبات ہیں لیکن ایک حوصلہ مند شاعر کے لئے غم اس کے فن کے لئے سب سے بڑی نعمت ہے۔ حیات و موت کے درمیانی وقفے میں جب ایک حساس شاعر اپنی زندگی کا سفر طے کرتا ہے تو وہ غم کی مختلف راہوں سے گزرتا ہے اور غم ہر منزل میں اس کا ہم سفر ہو جاتا ہے تو غم کے کئی روپ اُسکے نگاہ وہ دل میں مرتسم ہو جاتا ہے۔ کبھی مقصد کے ناکامی کا غم ہوتا ہے کبھی جفا کاری کا غم، کبھی بے وفائی کا غم، کبھی ہجر دوستاں کا غم، کبھی مرگ اعزاء کا غم، کبھی سماج میں رونما ہونے والے واقعات، حادثات، واقعات و مشاہدات کا غم، کبھی کبھی فریب کھانے کا غم، کبھی مجبور اور سسکتی ہوئی زندگی کا غم، کبھی تعصب و تنگ نظری کا غم، کبھی خود غرضی و بے اعتنائی کا غم، کبھی حسرت دار ماں کے لٹ جانے کا غم، کبھی عشق و محبت کا غم، غموں کے اس طوفان میں عام لوگوں کی ذہنیت کے قطع نظر شاعر کا ذہن ایک تجربہ گاہ کی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اور ذہنی تجربات داخلی اور خارجی حیثیت سے جب فکر و خیال سے ٹکراتے ہیں تو شاعر کے غم میں صداقت کا رنگ صاف طور پر جھلکتا ہوا نظر آتا ہے اور پھر صداقت غم میں ڈوبے ہوئے جذبات کے رنگ جب فکر و خیال کے پردوں پر بکھر جاتے ہیں تو کئی رنگ و نور کی تصویریں اُبھر آتی ہیں "کھلی آنکھوں کے خواب" کے شاعر کا حوصلہ مند دل بھی مختلف جذبات سے آشنا رہا ہے۔ زندگی میں تجربات و مشاہدات سے حاصل ہونے والے غم صرف عزاداری کی حد تک محدود نہیں ہوتے بلکہ یہ غم جہاں زندگی کے تلخ حقائق کا اظہار کرتے ہیں وہاں شعور غم کی پرورش کر کے عزم و حوصلہ کو پختگی عطا کرتے ہیں۔ جہاں دار افسر کا غم میں بھی ایسی ہی ہمہ گیری ہے۔ وہ کہیں غم جاناں، غم دوراں، غم انساں کے مارے ہوئے ہیں کہیں آپ بیتی کا غم ہے اور کہیں جگ بیتی کا غم۔ جہاں دار افسر کا غم ڈوبتے ستاروں کا ماتم گسار نہیں بلکہ

آنے والی سحر میں حسرت و یاس، تمنا، تڑپ، آرزو کے لئے تسکین کا منتظر رہتا ہے۔ اور اسی امید کے سہارے وہ کہتا ہے۔

زندگی تو پھول بھی ہے خار بھی
کس طرف لے جائے قسمت کیا کہیں

جہاں دارافسر نے جب اپنے اطراف کی دنیا دیکھی تو انہیں انسانیت کی جابجا عریانیت نظر آئی چنانچہ وہ اس مشاہدہ غم سے متاثر ہو کر کہتے ہیں۔

تمنا، آس حسرت آرزو ارمان بکتے ہیں
یہ سب کیا چیز ہیں اس دور میں ایمان بکتے ہیں

اور انسانیت کے بازار میں اس ارزانی کو بھی دیکھئے یہ مشاہدہ غم بھی کتنا روح فرسا ہے۔

ہوا ہے حرص کوشی کی فضا ہے خود فروشی کی
دکانیں سج گئی ہیں ظرف کی انسان بکتے ہیں

ایک دردمند شاعر کے لئے کردار کشی کا اس سے بڑھ کر اور کیا غم ہوگا۔

وقارِ نفس خودداری، حیا، احساس پنداری
بڑی مشکل سے ملتے ہیں بہت آسان بکتے ہیں

ایک انسان اور ہزار غم سماج میں رہنے والے ناسوروں کا علاج پھر بھی ممکن ہے۔ لیکن جہاں دارافسر کے حساس دل میں ایک ایسا غم بھی موجود ہے جہاں فریب جہل سے خرد آسودہ خاطر ہوتی ہے اور فریب خوردگی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ان فریب خوردہ انسانوں کو کس طرح سمجھایا جائے کہ یہ روحانی بازار اپنی معاشی اسودگی کے کس طرح سرگرم عمل ہیں۔

یہ ملاؤں کی منڈی ہے دکانیں ہیں دعاؤں کی
عقیدت رہن ہوتی ہے یہاں فیضان بکتے ہیں

نیکی کر دریاء میں ڈال جہاں دارافسر نے اس غم کو بھی اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔

ہوا ہوں خاک اے خاکِ وطن تری خاطر
وفا شعاری کا اچھا صلہ ملا ہے مجھے

مصرع ثانی میں طنز کی بے ساختگی بھی اپنا جواب نہیں رکھتی ہے۔جس دور میں شاعر زندگی گذار رہا ہے وہ اس مشاہدہ غم سے یہ کہنے پر مجبور ہے

نہیں ہے سنگ میں شیشہ میں امتزاج کوئی
مری سرشت سے یہ دور کیا ملا ہے مجھے

زباں سے تعصب و تنگ نظری کا احساس شاعر کے دل کو کچوکے دیتا ہے وہ ایک ایسے غم سے دوچار ہے جہاں بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری کے مصداق خاموشی بول اُٹھتی ہے۔

زباں پہ مہر لگا لے زباں کی بات نہ کر
امیر شہر کا یہ فیصلہ ملا ہے مجھے

چند اشعار جذبات غم سے مملو درج ذیل ہیں جس میں طنز کی نشتر بھی ہیں اور اخلاقیات کا درس بھی۔

غم فروغِ جہل ۔

وہ تیرگی ہے کہ اب روشنی بھی زخمی ہے
فروغ جہل سے دانشوری بھی زخمی ہے

غم ہوس ۔

چلی ہے تیغِ ہوس ہائے کس سلیقہ سے
خیال وفکر کی شائستگی بھی زخمی ہے

غم حسد بے جا ۔

حسد کی آگ سے روشن تھا اک اک گوشہ
عجب تھے جلتے ہوئے گھر ہم نے دیکھے ہیں

غم دوست نما دشمن ۔

گلے پہ چلتے ہیں لیکن خبر نہیں ہوتی
وہ آستینوں کے خنجر جو ہم نے دیکھے ہیں

غم دروغ گوئی ۔

بعض لوگوں سے جو ازرہِ تحقیق ملے
دشمنِ صدق و صفا نام کے صدیق ملے

غم آدمیت ۔

آدمیت کا کچھ پتہ ہی نہیں
یوں تو ہر شخص آدمی ہے میاں

غم فرقہ واریت ۔

بھڑک اُٹھے ہیں شعلے کیسے کیسے
مرے ہندوستاں جنت نشاں میں

غم مرگِ ضمیر ۔

ظرف و ضمیر معنی و مفہوم کھو چکے
دل ڈھونڈتا ہے صاحب کردار کون ہے

**انفرادیت غم:** وجدان فکر کی منزل میں غم کی صفات ایک علحدہ خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں۔اس منزل میں، آرزو، حسرت، تمنا، اُمید و خوف تسلیم و رضا کے تابع رہتی ہیں۔اور اس کے ہمراہ غم عشق چاہے وہ حقیقی ہو کہ مجازی منزل منزل گامزن رہتا ہے۔منزل عشق میں غم کی یہ انفرادیت نئی جہتوں سے روشناس کرواتی ہے۔جہاں دار افسرؔ کے غم کی انفرادیت کا تعلق ہے وہ مختلف نوعیتوں سے زندگی کی بساط پر بکھری نظر آتی ہے۔ان کے کلام میں کہیں غم جاناں بھی ہے کہیں غم انساں اور کہیں غم

دوراں اور اس غم کو جوان کے کلام میں موجود ہے۔ ہم اس کو ایک امید افزاء غم سے تعبیر کر سکتے ہیں. اور اسی غم کے سہارے انھوں نے وجود مطلق کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں خدا کے جلوؤں کی ضیا پاشی ہے۔ اور اس خدا کے وجود کا اظہار ہوتا ہے لیکن ایک ٹوٹے ہوئے دل میں خدا وجود ایک امید افزاء غم کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور یہ صفت بھی خدا کے وجود کو قائل کرنے کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

کہیں جو دل کبھی ٹوٹا ہوا ملا ہے مجھے
خدا گواہ وہیں پر خدا ملا ہے مجھے

امید افزاء غم درد کے رشتے کو استوار کرنے میں ایک اہم فریضہ انجام دیتا ہے۔ جہاں دارافسرؔ کہتے ہیں ۔

تمہارے درد کا رشتہ عجیب رشتہ ہے
اسی سے زیست کا اک سلسلہ ملا ہے مجھے

وجدان فکر کی اساس پر درد وغم کی یہ کیفیت بھی قابل تحسین ہے کہ ضبط غم وقار عشق کو قائم رکھنا کمال ظرف کی بات ہے۔

جہاں دارافسرؔ نے اپنے احساس کو لفظوں کی زباں دی ہے۔

بیان درد کیا کیجئے زباں سے
وقار درد گھٹ تا ہے بیاں سے

جہاں دارافسرؔ کا غم عشق ایک ایسی نعمت سے سرفراز نظر آتا ہے جہاں محبوب کی محبوبیت کے سوا اور چیز سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا بلکہ محبوب اور محبوبیت ہی اُن کے لئے سب کچھ ہے۔ یہ شعر عشق مجازی و حقیقی دونوں حیثیت سے قابل داد ہے ۔

تمہیں حاصل جو سمجھے زندگی کا
اُسے مطلب نہیں سود و زیاں سے

غم دنیا بھی انسان کی زندگی میں حسرت، مایوسی اور نا امیدی کے جذبات کو فروغ دیتے ہیں۔ انسان

شاہرہ حیات میں سامان حیات رکھنے کے باوجود موت کے آگے بے بس اور مجبور ولاچار ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا منظر عیش و آرام کی ہر چیز رکھنے کے باوجود پھر بھی اُسکی آنکھوں میں سب سے جدائی کا منظر آنکھوں میں پھرتا ہے۔ صاحبانِ فکر ونظر کے لئے جہاں دارافسرؔ کا شعر درس عبرت ہے۔

ایک دن تجھ سے جدا ہوں گے یہ سامان حیات
دولت وجاہ وحشم پہ نہ بھروسہ کرنا

کہیں کہیں فانی کی یاس جہاں دارافسرؔ کے کلام میں نظر آتی ہے۔

مری حیات غموں کے سوا نہیں کچھ بھی
دعائے عمر مرے حق میں بدعا سی ہے
کوئی مونس نہیں ہمدرد نہیں تیرے سوا
بے کسی توہی بتا کس کو پکارا کرنا

جہاں دارافسرؔ کی یاسیت اُن کے ہاں لمحاتی اثر رکھتی ہے۔ وہ غم کو سرمایہ حیات سمجھتے ہیں۔ غم کے صفات سے جو قلب آشنا ہوتا ہے وہی غم کی قدر قیمت کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے غم زندگی کو ایک ایسے شعور سے روشناس کرتا ہے جہاں آلام و مصائب میں صبر و شکر کے صفات اُسکو دائمی سکون و عافیت کا پیغام دیتے ہیں۔ غالبؔ کا شعر ہے۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

جہاں دارافسرؔ بھی غم کی اس منزل میں ایک حساس انسان کی صفات غم کا تعین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اس شعر میں جو بات
( in direct ) کہی گئی ہے وہ قابل تحسین ہے۔

غم کا جو ہو شعور تو غم بھی حیات ہے
حساس آدمی کی خموشی بھی بات ہے

اس شعر میں ادراک غم کے ساتھ ساتھ (خموشی) میں ضبط غم کی بات بھی کہی گئی ہے۔ اسکے علاوہ یہاں لفظ خموشی صبر کی ایک رمزی علامت کا اظہار ہے اور خموشی میں سکونِ بے پایاں کی لذت کمال ظرف بھی ہے۔

جہاں دارافسرؔ نے خلوت میں انجمن آرائی کا کس خوبی سے اہتمام کیا ہے شعر ملاحظہ کیجیے

ہجوم غم، تمنائیں، امیدیں
اکیلے پن میں بھی اک قافلہ ہوں

بعض شعر آپ بیتی کہتے ہیں۔ اور وہ زندگی کے حقائق کے پس منظر میں لکھے جاتے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو دل میں سلگتا ہوا احساس جب شعر کے قالب میں ڈھل جاتا ہے تو شعر کے لفظ لفظ میں زندگی کی داستان بکھری ہوئی نظر آتی ہے۔ اور وہ داستانِ شرحِ غم ہوتی ہے۔ جب انسان پر غموں اور مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں تو وہ ہمت ہار بیٹھتا ہے یا حوصلے کے بل بوتے پر موت پر فتح پانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اس عرصہ کارزار میں زندگی کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ سنگلاخ زمینوں میں ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ زمانہ دشمن ہو جاتا ہے۔ یگانے بیگانے ہو جاتے ہیں .دوست آستین کے سانپ بن جاتے ہیں۔ کبھی اخلاقی سطح پر حیا سوز نظاروں میں دل و نگاہ کو شائستگی کے آداب سکھانے پڑتے ہیں۔ ضمیر فروشی کے بازار اپنے ظرف اور خودداری اور غزت نفس کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ کبھی زندگی افلاس کے سمندر میں غوتے کھانے لگتی ہے۔ کبھی مجبوری اور بے کسی کا ایسا منظر دیکھنے کو اپنے مقدر کا نام دینا پڑتا ہے۔ کبھی جواں بیٹے کی لاش کو بڑھاپے کے ناتواں کندھوں پر اٹھانا پڑتا ہے۔ اور کبھی وطن میں رہتے ہوئے بھی غریب الوطنی کی زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ اور ایسے وقت میں مشیت ایزدی اور منشائے قدرت کے تقاضوں کے مطابق سرِ تسلیم خم کرنا ہی زندگی قبول بارگاہ ہونے کے مترادف ہے کیونکہ یہ آزمائش کا دور اور امتحان کی کڑی منزل ہوتی ہے اور ایسے وقت میں زندگی تپتے ہوئے لق دق صحرا میں بے یار و مددگار تشنہ لب اور جاں بلب ہوتی ہے۔ بقول جہاں دارافسرؔ ؎

مکمل حادثہ ہے زندگانی
گزرنا ہے مسلسل امتحاں سے
ہر لمحہ اک حشر کی تمہید بن گیا
کب تک میں تاب لاؤں بہت تیز دھوپ ہے

جہاں دار افسر کی زندگی بھی حسرت و یاس، درد وغم کے دورا ہے پر ہم کو ایک بچھڑے ہوئے ساتھی کی طرح ملتی ہے۔ مہدی عابدی نے اپنے مضمون ۔۔ ''جہاں دار، میرا ساتھی، میرا دوست'' میں اپنی طرز تحریر میں کردار و خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''میرا ساتھی، میرا دوست طرحدار ہے، آج بھی اس نے اپنی کج کلاہی اسی بانکپن کے ساتھ سلامت رکھی ہے۔ اس کے کردار کی یہ خوبی کتنی پیاری ہے کہ ایسے وقت میں بھی جبکہ بہت سے پختہ کاروں کا عقیدہ ڈگمگا گیا۔ وہ ایک گیرو محکم گیر کے اصول کا نگہدار بنا ہوا ہے اس نے تشکیک کی اس دھندلی فضا میں بھی شمع یقیں کو فروزاں رکھا ہے دور حال پریشاں کا گرفتار ہونے کے باوجود مستقبل تاباں سے گریزاں نہیں. حالانکہ لوگ حالات کے بدلتے ہی بدل جاتے ہیں. خاندانی ڈیوڑھی کے بکنے کے بعد لامکاں کا یہ بندہ خود بھی بے مکان بن گیا اور خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہا ہے. بنجاروں کی طرح بنڈی پر توشک خانہ لادے ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف چلتا رہتا ہے نہ جانے اُسکے پاؤں کی یہ گردش کب ختم ہوگی . اور کب تک وہ یوں ہی حسرتوں کا کفن پہنے اپنے ہی تابوت کے پیچھے ایک قبر کے بعد دوسری قبر ڈھونڈتا پھرے گا۔

مہدی عابدی کے توسط سے جہاں دار افسر کی زندگی کے واقعات کا پس منظر ذہن کے گوشے در آیا ہے۔ جس میں درد وغم کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں اُن کی ایک نظم ''مشیت ایزدی بھی سن لیجئے جو حادثات زندگی کی ایک تصویر پیش کرتی ہے۔

(مشیت ایزدی)

مرے مولا

مشیت آپ کی تو

آپ ہی جانیں

مگر مجبور بندوں سے

یہ کیسا امتحاں ہے

کہ بیٹا باپ کو کندھا نہ دے

اور آخری مٹی نہ دے

بجائے اسکے

ایک بد بخت کو یہ حکم ہو کہ

جواں بیٹے کا لاشا سامنے ہے

ذرا تابوت کو کندھا تو دینا

لرزتے دل سے

اپنے کانپتے ہاتھوں سے

اس کو آخری مٹی بھی دے دو.

جبر مشیت کا اذیت ناک تجزیہ جب نا قابل فراموش سانحہ بن جاتا ہے تو ایک عام انسان کے دل کی کربنا کی اُسکے ذہن میں کروٹیں بدلنے لگتی ہے .اور ایک حساس شاعر ہجوم غم میں یہ کہہ اٹھتا ہے۔لیکن یہ بات ہجوم غم سے گھبرا کر نہیں بلکہ اپنے حوصلے کے بل بوتے پر یہ کہنے پر قادر ہوتا ہے کہ میں تو اس لائق تو نہیں تھا۔مگر مشیت نے مجھے اس قابل سمجھا یہ بہت بڑی بات ہے شعر ہے ؎

کیوں بندا گانِ عام سے یہ سخت امتحاں

پروردگار یہ تو رسولوں کی بات ہے

مسلسل حادثات اور زندگی کے بے ثباتی انسانی کو ایسی امیدوں سے وابستہ رکھتی ہے جو انسان کے لئے زندہ رہنے کی خواہش کا احساس اور بڑ جاتا ہے۔وہ اس اعتقاد کو اپنا مقصد قرار دیتا ہے کہ حادثات سے گزرنے کے بعد بھی ایک نئی زندگی کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں. ڈاکٹر مغنی تبسم اپنے مقالے ''فانی بدایونی'' میں لکھتے ہیں کہ

'' ہستی کی ناپائیداری کا احساس ہمیں عقل کے ذریعہ ہوتا ہے لیکن ہمارا دل اسے ماننے کے لئے تیار نہیں رہتا کہ سچ مچ ہماری زندگی اتنی مختصر اور بے حاصل ہے''۔

اسی جذبے کے تحت ہر انسان میں زندہ رہنے کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ چاہے اُسکی زندگی ہزار غم سے عبارت ہو چنانچہ جہاں دار افسرؔ کہتے ہیں ؎

افسرؔ حیات نو کے لئے جستجو کرو

یہ زندگی تو سلسلۂ حادثات ہے

**اخلاقی عنصر** : شخصیت اور کردار کی تعمیر میں سب سے زیادہ اہمیت اخلاقی نظام کی ہے۔ اخلاقی نظام جتنا مستحکم ہوگا. شخصیت اور کردار میں اسی قدر وسعت پیدا ہوتی ہے پیار، خلوص اور محبت کے جذبے، خودداری، تہذیب وشائستگی، وضعداری، عزت ونفس، ہمت وجرأت، صداقت، ضمیر کی بے باکی، صبر وتحمل، احساس تشکر، عزم واستقلال انسانی زندگی کے محور پر گھومتے ہوئے ایک ایسا دائرہ بناتے ہیں۔ جسکی وجہ سے شخصیت ماحول کو اپنا بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے شخصیت کا اثر جتنا زیادہ ہوگا اخلاقی نظام کا یہ دائرہ اتنا ہی وسیع ہوگا۔ اخلاقی نظام مشکلوں میں زندگی کو سنوارتا ہے۔ جہاں دار افسرؔ کہتے ہیں ؎

ہم کو تو مشکلوں ہی سے ملتی ہیں لذتیں

دشواریٔ حیات سے بیزار کون ہے

وہ صفات جو اخلاقی نظام فکر کے دائرے میں آتے ہیں۔ وہ سب کے سب شخصیت میں کمال ظرف کی نشاندہی کرتے ہیں۔ آیئے اُن اخلاقی صفات کو جہاں دار افسرؔ کے مختلف اشعار میں تلاش کرتے چلیں ؎

صبر و تحمل ۔

ہمارے سر پر ہے جو دھوپ سائباں کی طرح
اسی پہ خوش ہوں کہ اک آسرا ملا ہے مجھے

عزتِ نفس ۔

لحاظ آبرو ہر وقت چاہیئے افسر
وہیں پہ بیٹھ جہاں سے کوئی اُٹھا نہ سکے

مزاجِ عقیدت ۔

کہاں ملیں گے بہتّر ہزار صدیوں میں
وہ جاں نثار بہتّر جو ہم نے دیکھے ہیں

شرط عزم راسخ ۔

سفر شرط ہے اجالوں کی کیا کمی
قدم قدم پہ فروزاں ہیں زندگی کے چراغ

عزم جواں ۔

جمود زندگی ہے مرگ ہستی
تمہید زیست ہے عزم جواں میں

دعوت سرگرمئ عمل ۔

لوگ ٹھہرے ہوئے دریا کی طرح ساکت ہیں
زندگی ہے تو پھر اس کی کوئی تصدیق ملے
احساس کا سکوت علامت ہے موت کی
کب تک یہ خاموشی رہے طوفاں کوئی تو آئے

وضع داری ۔

افسرؔ خوش نوا کی عمر دراز
وضع کا ایک آدمی ہے میاں

حوصلہ ۔

نہ ہوتا حوصلہ دل میں پھر مشکل ہی مشکل تھی
ہمارا حوصلہ لیکن ہر اک مشکل میں کام آیا

علامت حوصلہ ۔

ہے افسرؔ حوصلے کی اک علامت
حوادث ہیں اس سے ہی منسوب لوگوں
حوصلہ ہو تو حوادث کی حقیقت کیا ہے
وقت کے ساتھ یہ طوفاں بھی ٹل جاتے ہیں

عظمت توکل ۔

بوسہ دیتا ہے زمانہ انھیں ہاتھوں کو جنھیں
غیر کے دست کرم سے کوئی رشتہ نہ رہا

شانِ افسری ۔

افسرؔ کو کارِ خیر میں حاصل ہے افسری
اس کے سوا جہاں میں جہاں دار کون ہے

مشرب حق گوئی ۔

اپنا مشرب تو ہمیشہ سے رہا حق گوئی
لوگ حالات بدلتے ہی بدل جاتے ہیں

اُسلوب فغاں ۔

ہجوم درد و غم میں مسکرانا
فغاں کا یہ بھی ہے اُسلوب لوگو

عبدالقیوم خاں باقی نے کمال شعر کے تعلق سے یوں اظہار خیال کیا ہے کہ

"شعر کی صفت یہ ہے کہ وہ جس طرح اچھے خیال کا حامل ہو تو اُسی طرح اچھے الفاظ کا قالب بھی اختیار کرے ۸"

جہاں دار افسر نے خیال اور لفظوں کو اسی انداز سے اہمیت دی ہے۔ اُن کے ہاں شاعرانہ صداقت بھی ہے۔ اظہار بیان میں سلاست و روانی۔ بعض اشعار میں استفہامی انداز شعر کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے بعض شعروں میں طنز کے نشتر دل میں چبھن کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ذاتی احساس بھی ہے اور اُن کی فکر دوسروں کے جذبات کی ترجمان بھی۔ کہیں کہیں اعتقاد کی منزل میں عارفانہ خیالات کا بھی اظہار زیب کلام ہے۔ کہیں محاکاتی اور ڈرامائی انداز میں شعری خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ان کی شاعری میں جدید رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔ پرانی تہذیب کے دلدادہ ہونے کے سبب روایتی انداز بھی موجود ہے۔ رموز و علائم میں جہاں ساقی و پیمانہ کا ذکر ہے وہیں شیخ و کعبہ بھی نظر آتے ہیں۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی فرسودگی سے اپنے دامن شعری کو بچائے رکھا ہے۔ لفظی تراکیب سے کام لیتے ہوئے پیرایہ اظہار کو خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے کلام میں عصری حسیت بھی موجود ہے۔ ہر شاعر کے ہاں عمر کے لحاظ سے فکر و فن میں تغیر آتا ہے۔ ابتدائی کلام میں عمر کی ابتدائی منزلوں میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا مطالعہ، محض مشاہدے کے اثر کو قبول کرتا ہے۔ تو درمیانی عمر کا حصہ، واقعاتی اثر کو قبول کرتا ہے اور عمر کا آخری حصہ فقط تجرباتی اور تجزیاتی نقطۂ نگاہ کا حامل ہوتا ہے۔ اور یہی تجربہ اور تجربے کا تجزیہ فکر و فن کی معراج ہوتا ہے۔

جسٹس سردار علیخاں نے اُن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی اچھی بات کہی ہے وہ رقم طراز ہیں۔

"جہاں دار افسر اپنی زندگی کے (۷۱) سال مکمل کر چکے ہیں فکر و عمل کے لحظ سے ہنوز جواں سال اور جواں ہمت محسوس ہوتے ہیں اُن کے فکر و عمل کا یہی عکس اُن کی شاعری میں ضوفشاں دکھائی دیتا ہے رابرٹ فراسٹ نے

لکھا ہے کہ شاعری مسرت سے شروع ہوتی ہے اور بصیرت تک پہنچتی ہے. فراسٹ کا یہ قول افسؔر پر صادق آتا ہیکہ اس نے ہنستے کھیلتے شاعری کا آغاز کیا اور اب مسرت سے گذر کر بصیرت کے منازل کامیابی کے ساتھ طے کر رہا ہے ۹

حواشی :

۱ عجاز حسین تاریخ ادب اُردو صفحہ نمبر (۷۷)
۲ اعجاز حسین، تاریخ ادب اُردو ص (۱۱۴)
۳ اعجاز حسین تاریخ اردو ادب ص (۲۰۶) ۴ ایضا ص (۲۰۰)
۵ ڈاکٹر یوسف حسین خاں اُردو غزل ص ( ) ۶ ایس اے روف بازگشت اپر تاثر صفحہ (۲۰) تا (۲۱) مطبوعہ گست ۱۹۹۵ء زیر اہتمام بزم سخن حیدر آباد
۷ ڈاکٹر مغنی تبسّم فانی بدایونی شخصیت و شاعری صفحہ (۱۸۲)
۸ عبد القیوم خاں باقی رسالہ الموسیٰ ''یادگار ولی'' مضمون صفحہ (۷۵)
۹ جسٹس سردار علی خاں مضمون ''جہاں دار افسؔر حیات و کائنات کا شاعر'' ماخوذ کھلی آنکھوں کے خواب صفحہ (۶)

# جہاں دار افسؔر کی نظم نگاری

۱۸۵۷ء کے بعد سے اُردو شاعری میں انقلاب انگیز دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری کی طرف توجہ دی گئی۔ ابتدائی دور میں آزاد اور حاؔلی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آزاد کے پنجاب میں ایک ادبی انجمن بھی قائم کی تھی. اس شعری انجمن میں طرح مصرع دینے کے بجائے کوئی عنوان نظم کے لئے دیا جاتا تھا۔ حاؔلی نے اس انجمن سے کئی نظمیں نیچرل اور اصلاحی کا انداز کی پڑھیں جسکی ملک گیر شہرت بھی ہوئی۔ اس طرح اردو شاعری میں نظم نگاری کا رجحان اور کچھ عرصہ بعد اسکو فروغ حاصل ہوا۔ یہ اقدام قدیم شاعری کے قطع نظر اصلاح معاشرہ کے لئے ضروری بھی تھا۔ تنقیدی نقطہ نظر نگاہ سے حاؔلی نے شعر کے معائب اور محاسن کا بھی تجزیہ کیا۔ اور غزل گو شعراء کی فکر کو بدلنے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ حاؔلی کو نظم نگاری کا امام قرار دیا جاسکتا ہے۔ بعد میں حاؔلی کی تقلید میں اور بھی شعراء نے نظم نگاری کے لئے قلم اٹھایا۔ اور ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری میں بھی ہمیں اصلاحی، معاشرتی اور اخلاقی رجحان ملتا ہے۔ خاص طور سے انھوں نے بچوں کے نفسیات کے لحاظ سے بچوں کے لئے اخلاقی نظمیں لکھیں۔

منشی دُرگا سہائے سرور جہاں آبادی کے ہاں بھی نظموں کا کافی ذخیرہ ملتا ہے۔ اُن کی نظموں میں زیادہ تر نیچر نظمیں ہیں جس میں منظر نگاری کے حسین مرقعے نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ اکبرالہ آبادی نے بھی اپنی نظموں میں طنز و مزاح کے ذریعہ اپنی پہچان بنائی۔ اور اس طنز و مزاح کے توسط سے خاص طور پر نوجوان نسل کو جو مغرب زدگی سے زیادہ متاثر تھی اسکو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ نظم طباطبائی باوجود قدیم رنگ اور قدیم روایات کے پابند ہونے کے انھوں نے جدید شاعری کے اردو شاعری میں کامیاب تجربے کئے۔ خاص طور سے مغرب کے افکار و خیال انداز کو ترجمے کے روپ میں پیش کیا۔ خاص طور سے انھوں نے ڈامس گرے ایلجی کا ترجمہ گورِ غریباں کے نام سے کیا۔ جس کو اس کامیاب ترجمہ کی وجہ سے دائمی شہرت نصیب ہوئی۔ چکبست نے بھی قومی، سیاسی

اور اصلاحی نظموں سے شہرت حاصل کی۔ اقبالؔ نے اپنے کلام اور فلسفہ کی وجہ سے عالم گیر شہرت حاصل کی۔ حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام کے علاوہ اپنی دیگر نظموں اور گیتوں کی وجہ سے اردو شاعری کو شعری صداقتوں سے مالا مال کیا۔

اردو شاعری میں حالیؔ سے حفیظ جالندھری تک زیادہ تر مذہبی اور اصلاحی رنگ غالب رہا۔ اس کے بعد اُردو شاعری میں کچھ عرصہ کے لئے رومانی دور شروع ہوا جس میں جنسی ترغیبات خصوصاً نسوانی حسن سے زیادہ لگاؤ رہا۔ اس زمرے میں فطرت واسطی، مجاز اور اختر شیرانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس دوران سائینس اور فلسفہ کے فروغ اور وسیع مطالعے کی وجہ سے اردو شاعری بھی اس سے متاثر رہی. اور اسی سبب سے اصلیت اور واقعہ نگاری شعراء کلام میں جگہ پائی۔ غزل کے مقابلے میں نظموں کو لکھنے کا زیادہ رجحان، اُردو شاعری کے لئے ایک خوش گوارا اضافہ ثابت ہوا۔ غزل کے اسالیب میں تبدیلی آئی۔ علاوہ ازیں دوسری زبانوں خاص طور سے انگریزی ادبیات اور خیالات اردو ادب میں تراجم کی صورت میں ہمارے سامنے آئے۔ غزل میں پرانی روش سے ہٹ کر کچھ نئے انداز سے نغمہ سرائی کی جانے لگی تاثر اور ترنم کیساتھ جذباتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار میں ایک اچھوتے پن کی فضاء کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی رہیں۔ غزل میں عموماً فلسفہ حیات، حقیقت ہستی اور سماجی نظریات کو نئے لفظیات اور رموز علائم کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش ثمر آور ثابت ہوئی۔ جس سے شعر حسن میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

اس دور کے تیسری دہائی میں ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا اس تحریک کا مقصد ''ادب برائے ادب'' کے بجائے ''ادب برائے زندگی'' تھا۔ اس نظریے پر کاربند ادیب و شاعر مارکسی اور اشتراکی انداز فکر کے حامل تھے۔ اس تحریک کے زیر اثر جن ادیبوں اور شاعروں نے اپنا قلم اٹھایا اس سے اردو ادب، سرمایہ نظر کا حامل بن گیا۔ ترقی پسند تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ آزاد نظم کو فروغ حاصل ہوا جس میں ردیف قافیہ کی قید نہیں رہی البتہ وزن کو برقرار رکھا گیا۔ آہنگ شعر کے لئے کسی ایک بحر کے ٹکڑے کر کے نظم میں چھوٹے اور لانبے

فقرے لکھے جانے لگے. اور بحر کا وزن شروع سے آخر تک ایک ہی رہا۔ اور معنی و مطلب کے لحاظ سے ارکان میں کمی و پیشی کو ملحوظ رکھا گیا۔ اس طرح تھوڑی سی مدت میں اُردو شاعری میں آزاد نظموں کا ایک بڑا ذخیرہ اُردو شاعری کے لئے باعثِ اِفتخار ثابت ہوا۔ آزاد نظموں میں طبع آزمائی کرنے والوں میں علی سردار جعفری، عقیلؔ، ن۔ م راشدؔ، وامقؔ اور مخدومؔ کی شخصیتوں نے اہم فریضہ ادا کیا۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں ان نو جوان شعراء کا کلام سب سے پہلے حیات اللہ انصاری کے ہفتہ روزہ اخبار ''ہندوستان'' کے ذریعہ منظر عام پر آیا۔ اس زمانے کے رجحان اور فکر و خیال کے بارے میں ایک مضمون سجاد ظہیر نے ایک مضمون ''اُردو کی جدید انقلابی شاعری'' کے عنوان سے لکھا تھا اور اسی میں چند انقلابی شعراء کی بھی نشان دہی کی گئی تھی. جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر امتیازی خصوصیت حاصل کی جن میں علی سردار جعفری، معین احسن جذبیؔ مخدومؔ اور فیضؔ کے نام سرفہرست ہیں۔

ایک خاص بات یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ اس دور کے شعراء محبوب کے قائل تو ضرور ہیں لیکن محبوب سے یہ معذرت بھی کی گئی ہے کہ جنگ آزادی کے اس دور میں اس کی محبت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں. سردار جعفری کی نظم انتظار نہ کر اسی زمانے کی تخلیق ہے ؂

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر
عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرور عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے ساز محبت پہ گا نہیں سکتا
میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر!

اسی سلسلہ کی ایک کڑی مجاز کی نظم ''نوجوان خاتون سے خطاب'' ہے جس کا یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے ؂

ترے ماتھے کا یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
اسی آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

اسی سلسلے میں فیضؔ نے بھی کہا تھا ؎

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ ع

ترقی پسند تحریک کی انقلابی شاعری میں ایک رجحان، بغاوت، دہشت گردی بھی ہے۔ جو سرمایہ داری اور زمین داری نظام سے بغاوت اور تنفر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی نے سرمایہ داری نظام کے خلاف نوجوان شعراء کے فکر و خیال کو بغاوت کی ہوا دی۔ اور فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک نئی دنیا کی تعمیر کا خاکہ پیش کیا مجازؔ کی نظم انقلاب اسی رجحان کی پیداور ہے جس کا پہلا شعر ہے ؎

ختم ہوجانے کو ہے سرمایہ داری کا نظام
زندگی لانے کو ہے مزدور کا جوش انتقام

سردار جعفری کی نظم ''جوانی کے دو شعر اسی قبیل کے ہیں ؎

مرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خوں سے سرمایہ داروں کے
حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مسلک میرا مذہب نوجوانی ہے

مخدومؔ کی نظم ''موت کا گیت'' بھی اسی کیفیت کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے جس کا ایک بند یہ ہے ؎

زلزلو آؤ، دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ، گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ، جہنّم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں [۲]

اُردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے جواثرات مرتب ہوئے' وہی اثرات ہم کو جہاں دار افسؔر کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔ جہاں دار افسؔر کی نظم نگاری میں جہاں اُن کے ذاتی جذبات واحساسات کی جلوہ گری ہے وہاں انھوں نے اپنے تحت الشعور میں ایک عام انسان کے جذبات کو بھی جگہ دی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک ایسے پُر آشوب دور کی پیداور ہیں جہاں پُرانی تہذیب کے آثار مٹتے جار ہے تھے اور نئی تہذیب اپنی خیرگی سے نوجواں نسل کو متاثر کررہی تھی۔ ایک طرف جہاں دار افسؔر کی شخصیت شاہی خاندان کی تہذیب کا نمونہ تھی تو دوسری طرف وعصری تقاضوں کی ملی جلی تہذیب بھی اُن کی فکر سے دامن گیر تھی.اور وہ تشکیک اور بے یقین کے دوراہے پر کھڑے اپنے لئے ایک درمیانی راستہ تلاش کرنے میں سرگرداں تھے۔ وہ پُرانی تہذیب کے بھی دلدادہ تھے۔ اور نئی تہذیب کی روشن خیالی کے معترف بھی۔ اس نظریاتی کشمکش میں انھوں نے آنے والے حالات و واقعات سے پاکیزہ رشتہ استوار کرنے کو مناسب سمجھا۔ اور ایک بیدار ذہن کے لئے ایسا سوچنا ضروری بھی تھا۔ وہ احترام آدمیت کو مقدم جانتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے ادب برائے زندگی کا جونعرہ دیا اسکی قدر کرتے ہیں۔ زندگی سے مایوسی اور زندگی سے فرار یہ احساس ان کے لئے نا قابل قبول رہا ہے کیونکہ حالات کے تپتے ہوئے صحرا میں پیاسی زندگی کو جینے کا حوصلہ دینا اُن کے مطمح نظر رہا ہے۔ اور وہ بنی نوع انسان کو یہی پیغام دینے کے لئے اپنا قلم اٹھاتے ہیں۔ جہاں دار افسؔر کی نظموں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُن کا دل ایک عام انسان کے دل کی دھڑکن کے اثرات کو قبول کرنے کا عادی ہے اُن کی نظموں میں احساس غم کی ایک سلگتی ہوئی آگ ہے اور درد وغم کی ایک ایسی فضا پائی جاتی ہے۔ جسکے اثرات سے ماحول میں درد کے سائے لہراتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں لیکن یہ درد کے سائے ڈوبتی شام کے منظر نہیں بلکہ ابھرتے ہوئے سورج کے نظارے ہیں جس میں وقت کے ساتھ چلتے چلتے اپنے آپ کو احساس شکست سے بچانے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس لئے اُن کے کلام پر جب بھی گفتگو ہوگی اس میں امید افزاء غم کی بات ہوگی مستقبل کے حسین تعبیر کی بات ہوگی۔

جہاں دار افسر کی زندگی میں عصر حاضر کی تحریکوں نے ایک انقلاب عظیم برپا کیا خصوصاً ترقی پسند تحریک کا اثر تھوڑا زیادہ رہا کیونکہ یہ تحریک جہاں ادب عالیہ سے متعلق تھی وہیں پر وہ ہر انسان سے اس کی سسکتی تڑپتی زندگی سے اپنا رابطہ قائم رکھنا چاہتی تھی۔ سرمایہ داری نظام کے تحت جو مزدوروں‘ کسانوں اور بے سہارا انسانوں کا استحصال ہوتا رہا ہے اُس کے انسداد کے لئے اپنے افکار کو منظر عام پر لانا اس کا عین مقصد رہا ہے۔ اسی دور پر آشوب میں مارکسی اور اشتراکی مینوفسٹو نے بھی دنیا کے ایک عظیم خطے میں انقلاب کی لہر دوڑا دی ساتھ ساتھ اس کے حق مساوات کے سلسلے میں کمیونزم کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ سکیولرازم نے بھائی چارگی کو بڑھاوادیا۔ تعصب کے جذبات اور تنگ نظری کے احساسات کو ختم کرنے کی کوشش میں مثبت قدم اٹھایا۔ جہاں دار افسر کی زندگی میں یہ حالات واقعات بصیرت کی نگاہوں سے دیکھے گئے ایک طرف ان کے بیدار ذہن نے عالمی واقعات کے اثرات کو قبول کیا تو دوسری جانب انھوں نے مقامی روح فرسا حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھا۔ کامریڈ اسوسی ایشن کی جب حیدرآباد میں چند جیالے نوجوانوں کے توسط سے داغ بیل پڑی تو جہاں دار افسر نے بھی اس تحریک میں حصہ لیتے ہوئے اپنے جذبہ صادق کی تسکین کا سامان پیدا کیا۔ اور اسکے ساتھ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کرتے رہے۔ مسلسل حادثات سے گزرنے کا نام ہی زندگی ہے اور ایسی ہی زندگی جہاں دار افسر نے پسند کیا۔ اور حقیقت ہے کہ انھوں نے آپ بیتی کو جگ بیتی میں اور جگ بیتی کو آپ بیتی میں محسوس کیا گویا زندگی کے بہار و خزاں اُن کے لئے کھلی آنکھوں کے خواب تھے۔ اور وہ جانتے تھے کہ اس کی تعبیر کیا ہوگی۔

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش است

زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

بہار و خزاں کے اس موسم میں انھوں نے جو تجزیہ حاصل کیا۔ اور اس کا حاصل یہی ہے کہ زندگی سفر کرتے کرتے پیرانہ سالی کی منزل میں قدم رکھ چکی ہے۔ مگر ابھی حوصلہ جواں ہے۔ زندگی

کے تجربات، احساسات، جذبات اور مشاہدات کی روشنی نے ان کے فکر وفن کو جوانی بخشی ہے۔ اُن کے جوانکار، کھلی آنکھوں کے خوابوں کی تعبیریں لے کر نگاہوں کے سامنے رقصاں ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ کہتا ہے کہ شاعر کا کام یہ ہے کہ جذبات کو شاعری میں تبدیل کردے یہاں اُسے ان جذبات سے بھی مدد ملے گی جس کا اُس نے تجربہ نہیں کیا تھا۔ شاعر کا ذہن متعدد اور متنوع تاثرات کا خزانہ ہے اور وہ ان تاثرات کو ملا کر ایک نئی وحدت کو جنم دیتا ہے۔ شاعری جذبات سے فرار کا نام ہے شاعری اپنی شخصیت مٹا کر ہی اپنے تجربے کا معروض تلازمہ (objective correlative) تلاش کرتا ہے۔ اس طرح اس کا جذبہ غیر فانی ہو جاتا ہے۔ جذبات کو فن کی صورت ہئیت (Form) میں ادا کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اُس کا معروضی تلازمہ تلاش کرلیا جائے. معروضی تلازمے کے معنی یہ ہیں کہ فن پارہ بھی ایک شئ کی طرح جسے سوچ سمجھ کر ناپ تول کر محنت اور سلیقے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور جس کا مقصد ایک مخصوص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے. یہ اثر فنکار کے سامنے پہلے سے موجود رہتا ہے۔ فن کی شکل میں جذبات کے اظہار کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اشیاء کو اس طرح ترتیب دیا جائے موقع محل اور واقعات کے سلسلوں کو اس طور پر جمایا جائے کہ جب خارجی واقعات حسّی تجربوں کے ذریعہ ظاہر ہوں تو وہ مخصوص جذبات اُبھر آئیں جو نظم لکھنے سے پہلے شاعر کے پیش نظر تھے اسی تخلیقی عمل کو ایلیٹ معروضی تلازمات کے الفاظ میں یاد کرتا ہے [1]

ٹی ایس ایلیٹ کے ان خیالات کی روشنی میں جہاں دار افسر کی نظم ''اپنا گھر'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُن کے ذہن کے گوشے سے ابھرنے والا احساس ایک کربناک اذیت سے دوچار نظر آتا ہے۔

مرے گھر آج تجھے چھوڑ کر جا تا ہوں کہیں
کس جگہ جا نا ہے معلوم نہیں ہے مجھ کو

اور درمیان میں ماضی کی خوش گوار یادوں کی حسین پرچھائیوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اور ساتھ عہد رفتہ سے وابستہ تلخ حقیقتوں کے لرزتے سائے بھی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور پھر شاعر کے ڈوبے دل سے ایک آواز اُبھر کر فضاء میں حسرت ویاس کے نغمے بکھیر دیتی ہے۔

مرے گھر تجھ کو سلام

ایک میرے آنگن درودیوار چوکھٹ کو سلام

ایک بے کس کا سلام

ایک حالات کے مارے کا سلام

جہاں دارافسرؔ کی یہ نظم ''اپنا گھر'' تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے۔اس میں جذبات غم کی عکاسی اس طرح کی گئی ہے کہ ایک بے جان چیز (گھر) کے درودیوار ہجرت شاعر پر اپنی کامل افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جہاں دار افسرؔ کی نظم ''اپنا گھر'' جذبات غم میں ڈوبا ہوا ایک ایسافن پارہ ہے پڑھنے والے کو بھی حقیقی معنوں میں متاثر کرتا ہے ۔ اور یہی (objective correlation) اُن کی شاعری میں نظر آتا ہے اسی طرح اُن کی دیگر نظمیں ''یخ بستہ'' ''جواں سال بیٹے احتشام اکبر کی اچانک موت پر'' ''درمیانی کڑی'' ''شہید حسن ناصر کی یاد میں'' تلخ تجربہ اور بے مکانی وغیرہ میں (objective feelings) کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ہے ایسی غم افزایادیں ہیں جن کے نقش وقفے وقفے سے ذہن میں ابھرتے رہیں گے ''یخ بستہ'' میں جہاں دارافسرؔ نے یہ الفاظ کہہ کہ ؎

اے مرے حال پوچھنے والو

میں وہی بدنصیب ہوں جو کبھی

اک مسلسل حیات وحرکت تھا

اس میں ایک بے بس انسان کے زندگی کی داستان سنادی ہے۔نظم ''درمیانی کڑی'' میں بھی احساس غم کی چھاپ بہت گہری ہے ۔اس میں لفظ ''سایہ'' ''زور بازو'' اور شمع (objective feelings) کی نشاندہی کرتے ہیں۔سایہ کا اٹھ جانا' شفقت پدری سے محرومی زور بازو کا نہ رہنا' جواں بیٹے کی موت'' اور شمع سے زندگی کا سوز وگداز تعبیر کر کے'' درمیانی کڑی'' کے تاثر کو مستقل غم کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔

جہاں دارافسرؔ اپنی نظم ''جواں بیٹے کی موت'' پر کہتے ہیں ؎

یہ کونسا غم مل گیا ہے
ہر غم سے میں
اب آنکھیں چرانا چاہتا ہوں
کوئی کرتا ہے جب
صبر وتسلی کی نصیحت
تو یہ تلقین بھی
اک حادثہ معلوم ہوتی ہے۔

جہاں دارافسر کی اس نظم میں ٹریجیڈی اپنی انتہا پر دکھائی دیتی ہے۔شاعر زندگی کے ہر غم سے آشنا ہے.لیکن اس کو جو غم عطا ہوا ہے۔وہ المیہ کے عروج کو ظاہر کرتا ہے۔غالب نے بھی جواں مرگ عارف کی موت پر کہا تھا ۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

جہاں دارافسر کے یہ الفاظ ۔

یہ تلقین بھی اک حادثہ معلوم ہوتی ہے
کیا کسی قیامت سے کم ہے

جہاں دارافسر نے اپنا مقصد حیات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ

''مجھے اس کا کوئی رنج وملال بھی نہیں میں ڈوبتے تاروں کا غم گسار نہیں آفتاب تازہ کا استقبال کنندہ ہوں خاندان کی حد بندیوں کا اسیر رہنے کے بجائے میں نے خود کو اس عالمی برادری کا ذہنی رشتہ دار بنالیا ہے۔جو اعلی انسانی اقدار کی پاسداری، حریت پسندی، جمہوری پیش رفت کے لئے اپنے حالت کے مطابق مصروف جہاد ہے تا کہ دنیا سے رنگ ونسل، فرقہ کی تنگ نظری کے اندھیرے مٹ جائیں، سامراجی ریشہ

دوانیاں نیست و نابود ہوں اور سماجی انصاف سب کا مقدر بن جائے‘‘

جہاں دار افسرؔ کا یہ مطمح نظر احساس کی انفرادیت کا اظہار کرتے ہیں. شخصیت کا کردار ہر شخص میں اُسکے اپنے تفکر اور دائرہ عمل کے لحاظ سے جداگانہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ایک دردمند دل میں احساس کی انفرادیت روح کی گہرائی سے ابھرتی ہے. اور جس شخص میں احساس کی انفرادیت جتنی قوی ہوگی' اُسی قدر اُس کے دل میں اخلاص موجود ہوگا۔ اور وہ اخلاص کی ہی روشنی میں نہ صرف وہ اپنی حیات کے ساتھ انصاف کرتا ہے بلکہ دوسروں کی زندگیوں کا مطالعہ بھی اسی خلوص کے ساتھ کرتا ہے۔ اگر شاعر مخلص ہو تو اُس کا خلوص بے پایاں احساس کی انفرادیت کے تحت عصری تقاضوں سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھتا ہے۔ جس طرح کے اُس نے اپنی زندگی کے داخلی احساسات کا تجزیہ کیا ہے۔

جہاں دار افسرؔ نے اپنی زندگی کا اسی احساس کی انفرادیت کے تحت مطالعہ کیا ہے۔ ٹالسٹائی کہتا ہے کہ انسان کی فلاح آپس کے مل جھل کر رہنے میں ہے۔ اس نظرئے کی رُو سے جہاں دار افسرؔ نے اپنے فن شاعری کو فن برائے زندگی کے اصولوں پر قائم رکھا ہے اس سلسلے میں ان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے انسانی مسائل پر سیر حاصل گفتگو ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ آداب زندگی کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

دوستو ...سوچو تو
زخموں کی نمائش کب تک
اپنے ماحول کے نم دیدہ
شب و روز کا ماتم کب تک
زندگی جینے کے آداب نظر میں رکھو
اور جینے کا سلیقہ سیکھو..

جہاں دار افسرؔ کا یہ پیغام زندگی کو ایک حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اور یہ حوصلہ غم زندگی اور غم گیتی

دونوں سے نبرد آزما ہو کر موت پر فتح پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لئے ''بڑھاپے کی جوانی'' میں وہ کہتے ہیں ؎

میں اب ستر برس کا ہو گیا ہوں۔۔۔
مگر میں موت سے خائف نہیں ہوں
ابھی تک زندگی کا ولولہ اور حوصلہ بھی
مجھ میں زندہ ہے۔

احساس کی انفرادیت جب مادّی اشیاء سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے تو شاعر کا خلوص ان کی مادی اشیاء میں بھی اخلاقی صفات کی تابندگی کو محسوس کرتا ہے ۔ جہاں دار افسؔر نے کچھ ایسے رموز و علائم سے حقائق زندگی کے تابندہ صفات کو زندگی سے بہت قریب تر کر کے دیکھایا ہے۔ اُن کو اپنے وطن عزیز سے بے پناہ محبت تو ہے لیکن اہل وطن علاقائی عصبیت کا شکار ہیں

جہاں دار افسؔر اپنے احساس کی انفرادیت کی وسعت کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہوے کہتے ہیں۔ گنگا کی روانی میرے ایک جذبے کا نام ہے۔ ہمالیہ کی بلندی میری عظمت کا نشان ہے. تاج محل میری نفاست کی چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔ لال قلعہ میں میرے عزم مستحکم کی جھلک نظر آتی ہے۔ چار مینار میری محبت کی علامت بن کر اپنی باہیں کشادہ کئے ہوئے ہے۔ اور ایلورہ اجنتا کی جالیوں سے میرا حسن نظر جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سچ پوچھو تو یہ سب میری صفات عالیہ کے مظاہر ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کوئی بھی اس دائرے کی وسعت میں آنے کو تیار نہیں۔ ہر چھوٹا دائرہ اپنے وجود کو حقیقی جانتا ہے اور اسی دائرے میں محصور و مقید ہو کر اپنی دنیا تلاش کرتا ہے۔ جس کو مُلک بن کر رہنا چاہئے تھا وہ صرف علاقہ بن کر ہی خوش ہے۔ شاعر کو اس سے وسعت سے فرار پر تعجب ہوتا ہے. جہاں دار افسؔر کی یہ نظم بیگانہ خلوص کے لئے ایک طنز ہے اور وہ بھی چبھتا ہوا۔

جہاں دار افسؔر کی انفرادیت کا احساس اور بھی اس وقت گہرا نظر آتا ہے جب ہم اُن کی نظم ''گونگی شرافت'' پڑھتے ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے ظلم و زیادتی کو خاموشی سے سہنے پر ملامت کی ہے۔

کہتے ہیں ۔

یہ سب کچھ ہو رہا ہے
اور میں خاموش بیٹھا ہوں
مری گونگی شرافت پر
مرا احساس لعنت بھیجتا ہے

-----------

کہ اس گونگی شرافت کے بطن سے
ظالم اور قاتل
حوصلہ پاکر مکاں کو آگ دیتا ہے
مکیں کو قتل کرتا ہے

اور جہاں دار افسر ایک نظم ''ورثہ'' بھی اسی انداز کی دوسری نظم ہے جسکا آخری فقرہ ہے۔
شرافت ہم دکن والوں کا ورثہ ہے۔

جہاں دار افسر کی ایک اور نظم ''جام آگہی'' بھی اس تاثیر کو پیش کرتی ہے جسمیں مذہبی تعصب' لسانی زہر اور کالے دھن کی دُھن ہوس کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ بھلا بتائے جب ضمیر مردہ' کردار فنا ہو جائے اور معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو وہ وطن جس پر ہم کو ناز تھا' جس کی مٹی میں اخلاص و محبت کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ یہ غازۂ صفات' آرائش اخلاق کے لئے میسر ہی نہ ہو تو پھر وہاں حسن کی دنیا' رنگ ونور کی بستیوں کو تلاش کرنا بے مقصد اور لاحاصل ہی ہوگا اس نظم میں یہ سوال ہی جہاں دار افسر کے احساس کی انفرادیت کا مظہر ہے۔

جہاں دیر افسر نے اپنی نظم ''عصری ضرورتیں'' میں ماضی اور حال کا تقابل بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے دیکھئے کل کی بات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

میری محبوب مری جانِ سخن
عجب انداز سے یہ کہتی تھی
واپسی جلد اگر ہو
ساتھ سنگھار کا سامان لانا.
اور آج کی بات بھی کس قدر جاں گسل ہے

---

لیکن اب گھر سے نکلنے کے سبب
مجھ سے وہ کہنے لگی
سب سے پہلے میرے بچوں کو کتابیں لاؤ
اور چولھے کے لئے
گیاس کے تیل کا ڈبہ بھی ضروری ہے
رہے اس کا خیال.

آنکھیں بولتی ہیں۔ جہاں دار افسر کی ایک شاہکار نظم ہے جس میں احساس غم کی انفرادیت پوری طرح سے موجود ہے. جب احساس لفظوں میں ڈھل جائے تو ہر لفظ میں داستان سمٹی ہوئی نظر آتی ہے یعنی شاعر نے جن تاثراتِ غم کو نظم کی شکل دی ہے. وہ نظم ایک تصویر کے مانند ہو جاتی ہے۔ ایسی تصویر کو جتنا قریب سے دیکھا جائے اس کے نقوش آنکھوں میں سما جاتے ہیں۔ ''آنکھیں بولتی ہیں'' میں کالا بُرقعہ ایک ایسی علامت ہے جو ماحول کے افسردہ منظر کا ترجمان ہے۔ اور آنکھیں سماج کے یہہ منظر کا پوری طرح سے جائزہ لیتی ہوئی نظر آتی ہیں جس میں سماج کے رستے ہوئے ناسور اور زندگی کے ہلاکت خیزیوں کے منظر دکھائی دیتے ہیں. ''افلاس و نکبت''، ظلم و استبداد' تعصب و نفرت'' بوالہوسی و ہوس نا کی اور عصبیت و دہشت سب کچھ شامل ہے۔ اور اس پس منظر میں بے کسی و بے بسی کی دردناک آواز فضاء میں گونجتی ہوی سنائی دیتی ہے۔ مگر دیش کے دشمن دیش دروہی' بے رخی و بے اعتنائی کی اس منزل میں شاداں و

فرحاں نظر آتے ہیں۔ جہاں اُن کے کان سماعت سے مجبور اور آنکھیں بصارت سے محروم ہیں۔ جن کے سینے دردمندی سے نا آشنا ہیں. وہ مروت، محبت، اخلاص اور پیار کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں. لیکن احساس کی انفرادیت رکھنے والے شاعر کو وقت سے امید وابستہ ہے کہ ایک روز انقلاب آئے گا۔ دنیا کی کایا پلٹے ہوگی۔ ماحول کی افسردگی دم توڑے گی، ظلم واستبداد کے سائے چھٹ جائیں گے۔ نورِ سحر کی نئی روشنی بامِ رفعت سے پھیلے گی. پھر ایک بار ماں کی شفقت، بہن کی محبت، بیٹی کی عصمت کا اجالا اس سرزمین کو تقدس کا نور بخشے گا.

غرض یہ کہ جہاں دارافسرؔ نے اپنی معرا نظموں میں احساس کی انفرادیت کی جوت جگانے کی کامیاب سعی کی ہے. اُن کی دیگر نظموں میں بھی عصری حسیّت کارفرما ہے۔ انھوں نے زخم خوردہ سماج کا تفصیلی جائزہ لیا ہے. اُن کی شاعری میں نوجواں نسل کے لئے ایک ایسا پیغام جانفزا ہے جس میں عمل وحرکت کی تلقین کی گئی ہے. اُن کے شعری تاثرات میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز بھی ہے اور مزدوروں اور محنت کش طبقات کے لئے بھرپور نمائندگی بھی جہاں دارافسرؔ کی دیگر نظمیں آفتاب تازہ ۶/ڈسمبر ۹۲ء، سائے چھینو حیات مساوات کے چراغ، اے مرے شہر کے لوگو، بیس سال بعد، بے وطنی کا مرثیہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ خصوصاً اے مرے شہر کے لوگو میں جہاں دارافسرؔ نے، اخلاص، اخلاق ومروت، رواداری، وضع داری، سرفرازی، بصیرت وعظمت کی تابندگی کے لئے یادِ عہدِ رفتہ کے چراغ جلا کر نئی نسل کے لئے جو روشنی دی ہے وہ ہماری تہذیب وشائستگی، اتحاد واتفاق، اخوت اور قومی یکجہتی کے لئے حسیں اجالوں کا پیغام ہے۔

حواشی :

۱۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اُردو میں ترقی پسند تحریک...... صفحہ (۱۱۳)۔

۲۔ خلیل الرحمٰن آعظمی اردو میں ترقی پسند تحریک صفحہ (۱۱۸)

# جہاں دار افسرؔ کی قطعات نگاری

اُردو شاعری میں رباعی اور قطعات نگاری بھی ایک فن کی حیثیت سے متعارف ہوئی ہے۔ جہاں دار افسرؔ نے شاید رباعیاں کہی ہوں مگر اس مجموعہ کلام میں صرف چند قطعات ملتے ہیں۔ رباعی تو محض چار مصرعوں میں اپنے مطلب کو ادا کرتی ہے۔ قطعہ میں چار سے زیادہ مصرعے بھی لکھے جاتے ہیں رباعی کا چوتھا مصرع پہلے تین مصرعوں کا حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے رباعی کے چوتھے مصرعے کی اہمیت ہوتی ہے اور اسکو اچھے پیرائے میں مزین کیا جاتا ہے۔ جہاں دار افسرؔ نے اپنے قطعات میں رباعی جیسی شان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے قطعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ رباعی کی طرح قطعہ کے آخری مصرعے میں اپنے خیال کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے قطعات میں کہیں واردات عشق کی کیفیات میں کہیں حسن کے تصورات ہیں۔ کہیں عزم مصمم کی بات ہے اور کہیں اخلاقیات کا درس بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان قطعات میں سلاست اور روانی کی وجہ سے برجستگی پائی جاتی ہے۔ چند قطعات پیش ہیں۔

محبت کا مری دم بھرنے والو
مری توہین بے جا کرنے والو
ہے اس توہین سے تنقید بہتر
حقیقت سے ہمیشہ ڈرنے والو

جہد کے فکر کے عنواں کا خدا حافظ ہے
ظرف و کردار کے انساں کا خدا حافظ ہے
ہائے احباب بھی ناقدر بنے جاتے ہیں
اب جہاں دار علی خاں کا خدا حافظ ہے

مجھ کو انداز تکلم تیرا یاد آتا ہے
یعنی کے مجھ کو وہ ترنم ترا یاد آتا ہے
دیکھتا ہوں جو چٹخنے کلی کو میں کہیں
مجھ کو اے دوست ترنم ترا یاد آتا ہے

اس قطعہ میں مصرع ثانی اور چوتھے مصرعے میں قافیہ ترنم محل نظر ہے۔ چوتھے میر کلی کے چٹخنے کی مناسبت سے ترنم مناسب ہے۔ اور دوسرے مصرعے میں تکلم کے ساتھ تبسم اچھا معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے لب پہ ہنسی ہی کو دیکھنے والے
ہماری وجہ تسلی کو دیکھنے والے
ہمارے عزم و ارادوں کی بھی امیری دیکھ
ہمارے حال غریبی کو دیکھنے والے

خضہ جذبات کو بے باک سمجھ لیتے ہیں
عزم ناپاک کو پاک سمجھ لیتے ہیں
ایسے ماحول میں ناقدری کا شکوہ کیا ہو
لوگ سونے کو بھی خاک سمجھ لیتے ہیں

# جہاں دارافسرؔ کے کلام میں عَروضی وصوتی آہنگ

جہاں دارافسرؔ نے اپنے مضمون میں کہیں لکھا ہے کہ ''مجھے شاعری میں استادی یا ماہرعروض ہونے کا دعویٰ نہیں کیونکہ میں بیساکھیوں کا قائل نہیں ہوں''۔ اس میں شک نہیں شاعر کے لئے موزوں طبع ہونا کافی ہے اور عروض سے واقف ہونا ضروری نہیں لیکن جدید ادبی تنقید میں یہ رجحان بھی پایا جاتا ہے کہ شاعر کے کلام کو عروضی اور صوتیاتی نقطہ نظر سے بھی جانچا جائے۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ شاعر نے کس بحر اور کس صوتی آہنگ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور عروضی نقطہ نگاہ سے کس بحر میں زیادہ سے زیادہ اشعار کہے ہیں۔ اور شاعر نے کس انداز سے اپنے داخلی اور خارجی احساسات کو اِس کسوٹی پر استعمال کیا ہے۔ اسی خیال کے تحت ہم جہاں دارافسرؔ کے کلام میں عروضی اور صوتی آہنگ کا تجزیہ کریں گے۔ اور دیکھیں گے کہ انھوں نے اپنے لئے کس بحر کو زیادہ پسند کیا ہے اور اپنے اشعار میں مصمتے (حروف) اور مصوتے (حروف علت) اور ردیف' قافیوں میں لفظیات کے استعمال سے غنائی صورت پیدا کی ہے۔

عَروضی آہنگ: علم عَروض میں فن شعر کا مطالعہ جس مخصوص انداز سے ہوتا ہے اس میں اصوات کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ ملفوظی چھوٹی بڑی آوازوں کی ترتیب شعری آہنگ کو ظاہر کرتی ہے۔ ان آوازوں کو عَروض کی رؤ سے ارکان یا افاعیل کہا جاتا ہے۔ جو تعداد میں دس ہیں...... فعولن۔ فاعلن۔ فاعلاتن۔ فاع لاتن۔ مفاعیلن۔ مفاعلن۔ مفاعلتن۔ مستفعلن۔ مس تفع لن۔ مفعولات۔ اور ان ہی ارکان کی جوڑ توڑ سے مختلف دائروں میں مفرد اور مرکب بحریں بنتی ہیں۔ جن میں خماسی اور سباعی ارکان کا استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر عروض میں (۱۹) بحریں۔ اور زحافات سے بننے والی بحریں عربی' فارسی اور اُردو میں مستقل رہی ہیں۔ لیکن اردو میں صرف (۱۲) بحریں مروج ومقبول ہیں۔

جہاں دارافسرؔ نے اپنے کلام میں جن بحور کو استعمال کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱ ۔ دائرہ مجتلبہ ۔ بحر ہزج اور بحر رمل.

۲ ۔ دائرہ متفقہ ۔ بحر متقارب ۔بحر متدارک.

۳ ۔ دائرہ مشتبہ ۔ بحر مضارع ۔بحر مجتث ۔بحر مقتضب.

۴ ۔ دائرہ طوسیہ ۔ بحر جمیل.

تفصیل آگے دی جاتی ہے۔

# غزلیات۔ بحور و اوزان

| نشان سلسلہ | دائرے۔بحریں۔ اوزان | غزل صفحہ نمبر | تعداد اشعار | کیفیت |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | دائرہ مجتلبہ:- | | | |
| | ۱.بحر ہزج مثمن سالم.مفاعیلن (چار بار) | 20 | 7 | نعت |
| | ۲. ایضاً ایضاً ایضاً | 21 | 6 | نعت |
| | ۳. ایضاً ایضاً ایضاً | 83 | 8 | غزل |
| | ۴. ایضاً ایضاً ایضاً | 112 | 7 | غزل |
| | ۵. ایضاً ایضاً ایضاً | 126 | 2 | ۔ |
| | ۶.بحر ہزج مسدس عروض وضرب محذوف | 88 | 7 | غزل |
| | ۷.(مفاعیلن مفاعیلن فعولن.) | 90 | 1 | شعر |
| | ۸. ایضاً ایضاً ایضاً | 106 | 7 | شعر |
| | ۹. ایضاً ایضاً ایضاً | 114 | 7 | غزل |
| | ۱۰. ایضاً ایضاً ایضاً | 115 | 8 | غزل |
| | ۱۱. ایضاً ایضاً ایضاً | 128 | 2 | شعر |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| | ۱۲. بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعول مفاعیلُ مفاعیلُ فعولن.) | 110 | 7 | غزل |
| | ۱۳. ..... ایضاً ..... | 117 | 5 | غزل |
| | ۱۴. بحر ہزج مثمن اشتر (فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن) | 126 | 3 | شعر |
| | بحر رمل | | | |
| | ۱۵. بحر رمل مثمن عروض وضرب مقصور باقی سالم (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/فاعلات) | 45 | 4 | غزل |
| | ۱۶. ______ ایضاً ______ | 45 | 2 | شعر |
| | ۱۷. ______ ایضاً ______ | 86 | 7 | غزل |
| | ۱۸. ______ ایضاً ______ | 92 | 2 | شعر |
| | ۱۹. ______ ایضاً ______ | 113 | 7 | غزل |
| | ۲۰. ______ ایضاً ______ | 119 | 7 | غزل |
| | دائرے بحور اوزان | غزل | تعداد | |
| | ۲۱. بحر رمل صدر وابتداء سالم عروض وضرب مخبوں محذوف باقی مخبوں (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعِلن/فعْلن) | 92 | 5 | شعر |
| | ۲۲. ______ ایضاً ______ | 100 | 6 | غزل |
| | ۲۳. ______ ایضاً ______ | 111 | 5 | غزل |
| I | دائرہ مجتلبہ | | | |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| | ۲۴۔بحر رمل مثمن صدر و ابتداء سالم عروض و ضرب مخبوں مجذوف باقی مخبوں۔ (فاعلاتن فعلاتن فعلاتِن / فعِلن / فعلن) | 116 | 6 | غزل |
| | ۲۵۔ ______ ایضاً ______ | 121 | 8 | غزل |
| | ۲۶۔ ______ ایضاً ______ | 124 | 5 | غزل |
| | ۲۷۔ ______ ایضاً ______ | 129 | 2 | شعر |
| | ۲۸۔ ______ ایضاً ______ | 130 | 3 | " |
| | ۲۹۔ ______ ایضاً ______ | 131 | 3 | " |
| | ۳۰۔ ______ ایضاً ______ | 81 | 14 | نظم (آج کا شہر) |
| | ۳۱۔بحر رمل مسدس عروض وضرب مقصور۔ (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) | 80 | 7 | غزل |
| II | دائرۂ متفقہ | | | |
| | ۳۲۔بحر متقارب مثمن سالم فعولن (چار بار) | 91 | 4 | اشعار |
| | ۳۳۔ ______ ایضاً ______ | 130 | 7 | غزل |
| | ۳۴۔ بحر متدارک سولہ رکنی مخبوں مسکن۔ (فعلن فعِلن فعلن فعِلن فعلن فعِلن فعلن فعِلن) | 84 | 5 | غزل |

| نشان سلسلہ | دائرے بحور اوزان | غزل صفحہ نمبر | تعداد اشعار | کیفیت |
|---|---|---|---|---|
| | ۳۵۔ بحر متدارک مثمن بہ تغیر ارکان۔<br>فاع فعولن فعلن فعلن /<br>فاع فعولن فاع فعولن /<br>فعلن فعلن فعلن فعلن /<br>فعلن فاع فعولن فعلن | 118 | 6 | غزل |
| III | دائرہ مشتبہ | | | |
| | ۳۶۔ بحر خفیف مسدس صدر و ابتدا سالم، حشو مجنون عروض و ضرب محذوف / مسکن و مقصور فاعلاتن مفاعلن فعلن / فِعلن / فعلاتن | 87<br>103<br>104<br>123<br>126 | 5<br>6<br>7<br>7<br>2 | غزل<br>"<br>"<br>"<br>غزل |
| | ۳۷۔ بحر مقتضب مطوی، مطوی مسکن<br>(فاعلات، مفعولن فاعلات مفعولن) | 131 | 7 | غزل |
| | ۳۸۔ بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف / مقصور (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن / فاعلان) | 99 | 7 | " |
| | ۳۹۔ ______ ایضاً ______ | 101 | 9 | " |
| | ۴۰۔ ______ ایضاً ______ | 102 | 8 | " |
| | ۴۱۔ ______ ایضاً ______ | 105 | 6 | " |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| | ۴۲۔ ______ ایضاً ______ | 107 | 7 | " |
| | ۴۳۔ ______ ایضاً ______ | 108 | 5 | " |
| | ۴۴۔ ______ ایضاً ______ | 122 | 7 | " |
| | ۴۵۔ ______ ایضاً ______ | 129 | 3 | شعر |
| | ۴۶۔ بحر مجتث مثمن عروض و ضرب مخبون محذوف / | 85 | 9 | غزل |
| | ۴۷۔ مقصور، مسکن | 90 | 8 | " |
| | ۴۸۔ مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن / فعِلن فعلات / فعِلات | 91 | 3 | شعر |
| | ۴۹۔ ______ ایضاً ______ | 92 | 3 | " |
| | ۵۰۔ ______ ایضاً ______ | 93 | 5 | " |
| | ۵۱۔ ______ ایضاً ______ | 94 | 5 | غزل |
| | ۵۲۔ ______ ایضاً ______ | 96 | 5 | " |
| | ۵۳۔ ______ ایضاً ______ | 97 | 6 | " |
| | ۵۴۔ ______ " ______ | 98 | 5 | غزل |
| | ۵۵۔ ______ " ______ | 109 | 7 | " |
| | ۵۶۔ ______ " ______ | 120 | 9 | " |
| | ۵۷۔ ______ " ______ | 125 | 6 | " |
| IV | دائرہ طوسیہ | | | |
| | ۵۸۔ بحر جمیل مثمن سالم (مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن) | 95 | 5 | غزل |

# غزلوں اور اشعار کی تعداد

| نام دائرہ | نام بحر | تعداد غزلیات | جملہ اشعار |
|---|---|---|---|
| دائرہ مجتلبہ | بحر ہزج | 10 | 64 |
| ایضاً | بحر رمل | 10 | 97 |
| دائرۂ متفقہ | بحر متقارب | 2 | 13 |
| ایضاً | بحر متدارک | 1 | 11 |
| دائرہ مشتبہ | بحر خفیف | 4 | 29 |
| ایضاً | بحر مضارع | 7 | 52 |
| ایضاً | بحر مجتث | 9 | 71 |
| ایضاً | بحر مقتضب | 1 | 5 |
| دائرۂ طوسیہ | بحر جمیل | 1 | 5 |
| | | 45 | 347 |

| | | متفرق اشعار | | |
|---|---|---|---|---|
| | (۱) | بحر رمل | 28 | |
| | (۲) | بحر ہزج | 13 | |
| | (۳) | بحر مجتث | 11 | |
| | (۴) | بحر متقارب | 4 | |
| | (۵) | بحر خفیف | 2 | |
| | | | 58 | |

جہاں دار افسؔر کے مجموعۂ کلام کا عروضی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مذاق شعری کے تحت کن بحور کو پسند کیا ہے۔ ہر شاعر کا ایک مخصوص لب ولہجہ اور انداز فکر ہوتا ہے اور وہ اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے خاص بحروں کا بھی انتخاب کرتا ہے. تاکہ مافی الضمیر کو آسانی کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ شعراء کی کامیاب غزلیں اُن مخصوص بحروں میں زیادہ ہیں جو اُن کے جذبات اور طبعی میلان سے زیادہ ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں اکثر شعراء کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کا کلام زیادہ تر بحر رمل 'بحر ہزج' بحر مجتث اور بحر مضارع میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان بحروں میں جذبات وخیالات کو آسانی کے ساتھ لفظوں کے پیکر میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ مترنم ہونے کی وجہ سے اچھے انداز میں موسقیت کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور ان میں چھوٹے اور لانبے مصوتوں کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ سمویا جاسکتا ہے۔ غزل کا حسن اور بانکپن اور نغمہ ریزی محض مناسب لفظوں اور مصوتوں کی کثرت سے ظاہر ہوتی ہے اور ہر اچھا شاعر اپنی قادر الکلامی کے سبب اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے کہ جذبات کو کس ڈھنگ سے شعر میں سمودیا جائے اور اسکے لئے کونسی بحر مناسب رہے گی۔ سادگی 'سلاست اور روانی کا انحصار بہت کچھ بحروں کے انتخاب پر منحصر ہوتا ہے۔ جہاں دار افسؔر کے میلان طبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بحر رمل 'ہزج 'مجتث کی زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ کیونکہ الفاظ کو اپنی مرضی سے برتنے کا سلیقہ ان بحروں میں بڑی عمدگی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ سوز وگداز کی کیفیت کو ابھارنے اور نغمہ ریزی کے لئے ان بحروں سے کافی مدد لی جاسکتی ہے۔

جہاں دار افسر نے اپنی معریٰ نظموں میں بھی عروض آہنگ کو برقرار رکھا ہے۔ یعنی ایک بحر کے ٹکڑے کر کے اپنی نظموں میں سادگی' سلاست اور سوز وگداز کے مجموعی تاثر کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ عروضی نقطۂ نظر سے نظموں کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بحر ہزج اور بحر رمل کو اظہار بیان کے لئے زیادہ پسند کیا ہے۔ یہاں ان کے نظموں کی فہرست بحروں کے اوزان کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

I بحر متقارب ۔ فعولن فعولن فعولن فعولن ۔

اس بحر کو توڑ کر فقروں میں لکھی جانے والی نظمیں حسب ذیل ہیں

| | | |
|---|---|---|
| (۱) دعائے نیم شبی | | صفحہ نمبر 22 |
| (۲) ذرّے میں سورج | | صفحہ نمبر 27 |
| (۳) شب و روز | | صفحہ نمبر 43 |
| (۴) بے نام زندگی | | صفحہ نمبر 53 |
| | جملہ (۴) نظمیں بحر متقارب ہیں | |
| | | |
| II بحر مجتث ۔ | مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن | |
| (۱) زندگی کی دھوپ | | صفحہ نمبر 22 |
| (۲) شہید حسن ناصر کی یاد میں | | صفحہ نمبر 37 |
| (۳) بوسیدہ بیاض | | صفحہ نمبر 48 |
| (۴) حیات و مساوات کے چراغ جلاؤ | | صفحہ نمبر 61 |
| (۵) تلخ تجربہ | | صفحہ نمبر 66 |
| | جملہ (۵) نظمیں بحر مجتث میں | |
| | | |
| III بحر کامل ۔ | فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن / فعِلن | |
| (۱) اپنا گھر | | صفحہ نمبر 23 |
| (۲) کب تک | | صفحہ نمبر 27 |
| (۳) سورش حیات | | صفحہ نمبر 28 |

| | | |
|---|---|---|
| (۴) وسعت فرار | | صفحہ نمبر 29 |
| (۵) جام آگہی | | صفحہ نمبر 33 |
| (۶) عصری ضرورتیں | | صفحہ نمبر 35 |
| (۷) بے مکانی | | صفحہ نمبر 36 |
| (۸) رات کے ساتھ | | صفحہ نمبر 44 |
| (۹) زندگی | | صفحہ نمبر 46 |
| (۱۰) بنگلہ دیش | | صفحہ نمبر 59 |
| (۱۱) فیملی پلاننگ | | صفحہ نمبر 64 |
| (۱۲) روشنئ فکر و نظر زندہ ہے | | صفحہ نمبر 75 |
| (۱۳) بیس سال بعد | | صفحہ نمبر 77 |
| (۱۴) آج کا شہر | | صفحہ نمبر 82 |
| | جملہ (۱۴) نظمیں بحر کامل ہیں۔ | |
| IV بحر ہزج | مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن | |

اس بحر میں دیگر نظمیں ارکان کے تغیر کے ساتھ بھی لکھی گئیں ہیں یہاں سالم بحر کا وزن درج کیا گیا ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| (۱) دعا | | صفحہ نمبر 19 |
| (۲) مشیت ایزدی | | صفحہ نمبر 24 |
| (۳) کہو ہندوستان کی جئے | | صفحہ نمبر 30 |
| (۴) جواں سال بیٹے احتشام اکبر کی اچانک موت پر | | صفحہ نمبر 31 |
| (۵) گونگی شرافت | | صفحہ نمبر 32 |

| | | |
|---|---|---|
| (۵) سینہ خراشی | | صفحہ نمبر 49 |
| (٦) ایک سورج ہزار سائے | | صفحہ نمبر 76 |
| (۷) بے وطن کا مرثیہ | | صفحہ نمبر 79 |
| | جملہ (۷) نظمیں بحر خفیف ہیں | |
| | | |
| VI بحر متدارک | فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن | |

اس بحر میں بھی ارکان کے تغیرات کے ساتھ دیگر نظمیں بھی لکھی گئیں۔ یہاں سالم وزن درج کیا گیا ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| (۱) چار مینار کے عہد کی نظمیں | | صفحہ نمبر 43 |
| (۲) نئی نسل کے نام | | صفحہ نمبر 52 |
| (۳) آنکھیں بولتی ہیں | | صفحہ نمبر 55 |
| (۴) سائے چھینو | | صفحہ نمبر 60 |
| | جملہ (۴) نظمیں بحر متدارک ہیں | |
| | نظموں کی پسندیدہ بحریں | |
| I بحر ہزج | | 20 نظمیں |
| II بحر رمل | | 12 نظمیں |
| III بحر خفیف | | 7 نظمیں |
| IV بحر مجتث | | 5 نظمیں |
| V بحر متقارب | | 4 نظمیں |
| VI بحر متدارک | | 4 نظمیں |
| | جملہ | 52 |

اس اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں دار افسر نے جن بحور و اوزان کا انتخاب کیا ان میلان طبع نظموں کے لئے بحر ہزج، بحر رمل اور غزلوں میں بھی یہی رجحان پایا جاتا ہے۔

# صوتی آہنگ

اُردو نظام صوت دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے.

(۱) حروف علت جنھیں مصوتے کہا جاتا ہے. یہ تعداد میں دس ہیں. جن میں زیر، زبر، پیش، چھوٹے مصوتے ہیں اور باقی کے سات لامبے مصوتے ہیں جو ان آوازوں کو کھینچ کر پڑھنے سے بنتی ہیں۔

(۲) حروف صحیح جن کو مصمتے کہا جاتا ہے صوتی لحاظ سے ان کی تعداد (۳۷) ہے صوتیاتی نقطہ نظر سے بلحاظ مخارج اور ادائیگی ان کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے مصمتوں کی گروہ بندی بلحاظ مخارج حسب ذیل ہے۔

| | |
|---|---|
| (۱) دولبی | جن کے ادا کرنے میں دونوں ہونٹ ملتے ہیں۔ |
| (۲) لب دندانی | جو اوپر کے دانتوں اور نچلے ہونٹوں کی مدد سے ادا ہوتے ہیں۔ |
| (۳) دندانی | جن کی ادائیگی میں زبان کی نوک اوپر کے دانت سے ٹکراتی ہے۔ |
| (۴) لثوی | جن کے ادا کرنے میں زبان کی نوک اوپر کے مسوڑوں سے یا دانتوں کے پیچھے لگتی ہے۔ |
| (۵) کوز | جن کی ادائیگی میں زبان کی نوک تالو کی طرف مڑتی ہے ڑ۔ ڑھ کی ادائیگی میں زبان کی نوک تالو سے مس کھا کر نیچے گر جاتی ہے۔ |
| (۶) حنکی | ان اصوات کے نکالنے میں زبان کا اگلا حصہ تالو سے ملتا ہے۔ |
| (۷) غشائی | جن کے ادا کرنے میں زبان کا پچھلا حصہ تالو کے پیچھے لگتا ہے۔ |
| (۸) لہاتی | یہ صوت کوّے یا لہات کے قریب سے نکلتی ہے ۔ |
| (۹) حنجروی | جو حنجرے سے نکلتی ہے۔ |
| (۱۰) حلقی | جو حلق سے نکلتی ہے۔ |
| | ادائیگی کے لحاظ سے مصمتوں کو خصوصیات اس طرح ہیں۔ |

| | |
|---|---|
| (۱) بندشی | یہ اصوات ٹھوس اور بجتی ہوئی آوازیں ہیں۔اور اپنی ان خصوصیات کی بنا پر ارد گرد کی اصوات کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ |
| (۲) انفی مصمتے | یہ غنائی آوازیں نغمگی اور غم واندوہ کی کیفیات پیدا کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔ |
| (۳) پہلوی مصمتے | اس صوت میں بندشیت کے ساتھ کسی قدر صفریت بھی پائی جاتی ہے۔ |
| (۴) ارتعاشی مصمتہ | یہ آواز عام طور پر تسلسل حرکت اور تکرار کے اظہار میں معاون ہوتی ہے۔ |
| (۵) صفیری مصمتے | اس میں ایک صوتی تسلسل پایا جاتا ہے۔شعر میں ان سے مخصوص قسم کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً جذبات کی شدت اور ان کا صوتی نکاس وغیرہ۔ |
| (۶) حلقی مصمتہ | مصمتہ ہ کی نفسی کیفیت سے اکثر شاعروں نے حزن و یاس اور آہ کے اظہار میں مدد لی ہے۔ |

# جدول[1]

| اردو زبان کے مصمتے | | | دولبی | لب دندانی | دندانی | لثوی | کوز | حنکی | غشائی | حنجردی | حلقی |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| | غیر | غیر ہکار | پ | | ت | | ٹ | چ | ک | | |
| | مسموع | ہکار | پھ | | تھ | | ٹھ | چھ | کھ | | |
| بندشی | مسموع | ہکار غیر | ب | | د | | ڈ | ج | گ | | |
| | مسموع | ہکار | بھ | | دھ | | ڈھ | جھ | گھ | | |
| | مسموع | انفی | م مھ | | | ن نھ | | | | | |
| پہلوی | مسموع | | | | | ل لھ | | | | | |
| ٹھیک دار | مسموع | غیر ہکار | | | | | ڑ | | | | |
| | | ہکار | | | | | ڑھ | | | | |
| ارتعاشی | مسموع | | | | | ر | | | | | |
| صفیری | غیر مسموع | | | ف | | س | | ش | | خ | ہ |
| | مسموع | | | و وھ | | ز | | ژ | | غ | |
| نیم مصنونہ | مسموع | | | | | | | ی | | | |

صوتیائی نقطہ نظر سے مطالعہ شعر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ذریعہ ہم شاعر کے حسن خیال تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ لفظی اور معنوی خوبیوں کی بنیاد زیادہ تر صوتی نظام سے منسلک ہے۔ شاعر جتنا نازک خیال ہوگا وہ ایسے ہی لفظوں کو استعمال کرنے کی کوشش کرے گا جس میں موسقیت اور نغمہ ریزی موجود ہو۔ اس سلسلہ میں اس موضوع کے تحت ہم جہاں دار افسر کے کلام میں صوتی آہنگ کے زیر اثر مصمتوں اور مصوتوں کے استعمال کی خوبیوں پر نظر ڈالیں گے کہ اُن کے کلام میں صوتیاتی آہنگ کو کس انداز سے برتا گیا ہے

''کھلی آنکھوں کے خواب'' اس مجموعہ کلام کہ صفحہ (۸۰) پر جہاں دار افسر کی غزل ہے جس کا مطلع ہے

دین و دنیا کی حقیقت کیا کہیں
اک حکایت ہے حکایت کیا کہیں

اس غزل میں حرف 'ک' اور 'ت' مصمتے زیادہ استعمال کئے گئے ہیں۔ 'ت' اور 'ک' علی الترتیب دندانی 'غشائی اور غیر ہکار غیر مسموع بندشی مصمتے ہیں۔ قافیہ میں 'ت' ساکن اور ردیف میں نون غنہ انفی مصمتہ ہے۔ اس سے قافیہ پر سکتے کا اظہار اور 'کیا کہیں' میں افسوس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح سکتہ اور اظہار افسوس سے غزل میں تاثراتِ غم کی فضا قائم ہوتی ہے۔ غزل جس کا مطلع ہے۔ ؂

تمنا حسرت آرزو ارمان بکتے ہیں
یہ سب کیا چیز ہیں اس دور میں ایمان بکتے ہیں

اس غزل میں انفی مصمتوں کا زیادہ استعمال ہوا ہے اور اسکے علاوہ قافیوں میں کہیں انفی اور کہیں صیغری مصمتے موجود ہیں انفی مصمتوں سے غنائیتِ اور صغیری مصمتوں سے لب ولہجہ پر زور پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اس غزل میں ترنم کے زیر اثر ایک گونجتی فضا موجود ہے.

غزل جس کا مطلع ہے

ہم شہر میں رہتے ہیں لیکن رہتے ہیں کدھر معلوم نہیں
ہے شہر کے ہر ایواں پہ نظر اور اپنا ہی گھر معلوم نہیں

اس غزل میں قافیے کدھر، گھر، سحر، اگر، ہنر، راہ گذر استعمال ہوئے ہیں یہ سب ارتعاشی مصمتے ہیں۔ اور ردیف معلوم نہیں میں 'م' اور 'ن' کا انفی مسموع اتصال بھی ہے. جس کی وجہ سے غزل میں موسیقیت ہلکے ترنم کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔ اور قلبی تاثرات کے ذریعہ غزل میں حسرت و یاس کی فضا نظر آتی ہے۔

جفا کا دور بنام وفا ملا ہے مجھے
کسے بتاؤں زمانے سے کیا ملا ہے مجھے

اس غزل میں قافیے وفا، ہوا، خدا، آسرا، صلہ، سلسلہ، فیصلہ، سخا، فاصلہ وغیرہ ہیں۔ ان میں بعض قافیے ''ہ'' حلقی صیغری غیر مسموع پر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ قافیہ اور ردیف میں حروف علت کی کثرت کی وجہ سے غزل میں اثر آفرینی موجود ہے۔ کیونکہ مصوتوں کو موسیقی کی ضرورت کے لحاظ کم یا زیادہ پڑھا جا سکتا ہے۔

کچھ تو کہیے خوگر رسم جفا کیوں ہو گئے
آپ تھے جان و فا پھر بے وفا کیوں گئے

یہ غزل بھی قافیہ اور ردیف کا اعتبار کرتے ہوئے حروف علت کی کثرت پر مشتمل ہے۔ ساتھ میں لفظ 'کیوں' کا انفی مسموع مصمتہ بھی موجود ہے جسکی وجہ سے شعری آہنگ میں غنائی کیفیت کا مزید اضافہ ہوتا ہے ''کیوں'' کے استفہامیہ انداز سے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں ایک ایسا انداز پیدا ہوتا ہے جس سے طنز کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔

غزل نذر غالبؔ میں جسکا مطلع ہے۔

کونسا غم ہے جو عطا نہ ہوا
مجھ سے خوش کب وہ خوش ادا نہ ہوا

یہ غزل غالبؔ کی مشہور نغمہ ریز غزل

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

کی زمین بحرِ خفیف میں لکھی گئی ہے۔لیکن صوتی آہنگ کی رو سے اس غزل کی ردیف نہ ہوا میں تنافر لفظی موجود ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں، حسرت موہانی کے مصائب سخن کے متن کا حوالہ سے لکھتے ہیں۔ عیبِ تنافر کے زیرِ عنوان حسرت موہانی معائب سخن میں لکھتے ہیں۔

"جب کسی شعر میں دو ایسے لفظ متصل آجاتے ہیں جن میں سے پہلے لفظ کا حرف آخر وہی ہوتا ہے جو دوسرے لفظ کا حرف اول تو ان دونوں حرفوں کے ایک ساتھ تلفظ میں ایک خاص قسم کا ثقل اور ناگواری پیدا ہو جاتی ہے۔اس کا نام عیب تنافر ہے" ۲

مثالیں۔ ع۔ آنکھوں میں عالم سارا سیاہ ہے اب (سیاہ ہے) میرؔ

ع۔ اس کی چشم سیہ ہے وہ جس نے (سیۂ ہے) غالبؔ

ع۔ میرے پتے سے خلق کو کیوں ترا گھر ملے (خلق کیوں) "

ع۔ اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں (اشک کو) "

اس تعلق سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں وضاحت کرتے ہوئے لکھے ہیں۔

قدیم تنقید میں حرف اور لفظ کا تصور غلط اس لئے ہے کہ عیبِ تنافر صوتیات کا مسلہ ہے نہ کہ رسم الخط اور نہ صرف کا (۱) ایک ہی آواز بالخصوص منھ بند آوازوں کی علی الترتیب ادائیگی مشکل ہوتی ہے۔اوپر تنافر کی جس قدر مثالیں دی گئی ہیں ان کے صوتیاتی اصول ذیل میں مرتب کئے جاتے ہیں۔ اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں۔(ک۔ک) اس کی عضویاتی وجہ ظاہر ہے

(۲) ہم مخرج آوازوں مثلاً ک۔گ۔س ز کی علی الترتیب ادائگی میں دشواری ہوتی ہے۔اس میں پہلی غیر مسموع اور دوسری (گ۔ز) مسموع ہیں ایسی صورت میں لازماً اور ادغام کا عمل پیدا ہوتا ہے۔جسکی وجہ سے پہلی غیر مسموع آواز آنے والی مسموع آواز کے زیرِ اثر مسموع بن جاتی ہے۔اس قریب المخرج آوازوں میں تنافر اس لئے پیدا ہو جاتا ہے کہ ادائیگی کے وقت روانی میں مخرج قریب ہونے کی وجہ سے وہی عضویاتی وقت پڑتی ہے۔جو ایک ہی آواز علی الترتیب ادا کرنے میں ہوتی ہے۔یہاں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے صرف منھ بند اور ہم مخرج آوازوں کی وضاحت کی ہے۔ جہاں دار افسرؔ نے غالبؔ کی

زمین میں جو غزل کہی ہے۔

ع۔ کون سا غم ہے جو عطا نہ ہوا (نہ ہوا)

میں حرف (ہ) کا تنافر موجود ہے۔ لیکن حرف (ہ) غیر مسموع اور صیفری ہونے کی وجہ سے غزل کی نغمہ ریزی میں فرق نہیں پڑتا کیونکہ صیفری مصمتے کو تھوڑا سا جھٹکا دے کر پڑھنا پڑتا ہے. اسکے بجائے بندشی مصمتے ہوتے تو آوازوں کی ادائیگی میں مشکل پیش آتی۔ نذر مومن کی غزل میں جہاں دار افسر نے جو قافیہ اور ردیف استعمال کئے ہیں۔ وہ زباں۔ بیاں، کہاں. زباں، گلستاں، کارواں، یہاں۔ وغیرہ ہیں۔ اور ردیف (سے) ہے اس میں صیفری مصمہ. غیر مسموع اور (ے) نیم مصوتہ سموع ہے قافیہ میں انفی مصمتہ مسموع ہے لثوی اور خنکی مخارج کی وجہ سے غزل میں روانی اور تسلسل کی فضا برقرار رہتی ہے۔ جذباتی نقطۂ نگاہ سے غزل میں اظہار بیاں کی دھیمی لے موجود ہے. جس سے غزل میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں کہتے ہیں حروف علت کی کمی بیشی شعر کی کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے چھوٹی یا طویل بحروں میں حزن ویاس کی کامیابی کا دارومدار بہت کچھ حروف علت کی کثرت پر ہوتا ہے[۳] جہاں دار افسر کی غزل جس کا مطلع ہے۔

شعور و علم کے پیکر جو ہم نے دیکھے ہیں
کہاں ہیں اب وہ سمندر جو ہم نے دیکھے ہیں

اس غزل میں حروف علت کی کثرت کے علاوہ ردیف کا آخری انفی مصموتہ بھی موجود ہے. جس سے غزل میں حزن ویاس کے علاوہ موسقیت کا بہاؤ بھی ہے جسکی وجہ سے غزل میں درد کی لے موجود ہے۔ غزل جس کا مطلع ہے۔

ہر ایک سمت سے پتھر ہے آپ ساتھ رہیں
حیات آئینہ پیکر ہے آپ ساتھ رہیں

اس میں ارتعاشی مصموتوں کے ساتھ بندشی اور صیفری مصموتوں اور ردیف میں چھوٹے اور لانبے

مصوتوں کی وجہ سے غزل کی موسقیت میں ایک قسم کا ٹہراؤ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کا تکملہ ہوتا ہے۔اس غزل میں آپ ساتھ رہیں موسیقت کی لہر کا تکملہ ہے . اس سے غزل کے آہنگ میں تاثر پیدا ہوتا ہے۔غزل جس کا مطلع ہے ۔

بہار حسن چمن سلامت' فروغ لعل و گہر سلامت
ہزار جلوے ہیں ہر قدم پر اگر ہو ذوقِ نظر سلامت

اس غزل کے آہنگ کی خاص خوبی یہ ہے کہ بادی النظر میں مصوتے کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور مصمتوں میں بندشی مسموع۔ ارتعاشی مسموع اور صیفری غیر مسموع کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر مغنی تبسم نے اپنے ایک مضمون ''اصوات اور شاعری'' میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ صیفری مصمتوں کی ادائیگی کے وقت ہوا رگڑ سے باہر نکلتی ہے۔بندشی مصمتوں کے برخلاف ان میں ایک صوتی تسلسل پایا جاتا ہے۔اس طرح یہ اصوات شعر کے آہنگ میں جداگانہ اثر ڈالتی ہیں اور شاعری میں مخصوص قسم کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔مثلاً تسلسل (جذباتی یا صوتی) جذبات کی شدت اور ان کا صوتی نکاس وغیرہ۔مناظر قدرت کی بعض کیفیات بھی ان اصوات کے آبگینے میں منعکس ہوتی ہیں ؎

جہاں دار افسر کی اس غزل کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ صوتی اور جذباتی تسلسل کے ساتھ اس میں منظر کشی کی ایک ہلکی فضاء کا احساس ہوتا ہے۔جہاں دار افسر نے دو غزلیں ایسی بھی کہی ہیں جن کے مطلع حسب ذیل ہیں ۔

رکے ہمارے قدم یا ٹھہر گئی تاریخ
فریب جاگا حقائق کی مر گئی تاریخ

اور

نہیں بجھیں گے بجھانے سے زندگی کے چراغ
یہی چراغ کہ ہیں فکر و آگہی کے چراغ

ان غزلوں میں معنوی حیثیت سے نہیں بلکہ صوتی اعتبار سے بات کی جاسکتی ہے اس سلسلہ میں ڈاکٹر مسعود خاں اپنے مضمون مطالعہ شعر (صوتیاتی نقطہ نظر سے) واضح طور پر کہتے ہیں۔

''اردو شاعری کے صوتی تار و پور میں ق۔ خ اور غ بہت کم اثر انداز ہوئے ہیں۔ق کی صوتی قدر سے اردو داں طبقہ کا بڑا حصہ (مغربی پاکستان یا مستثنی سرحد) بے بہرہ ہے۔ خ اور ق بھی لہاتی اور غشائی، چیستانی آوازیں ہونے کی حیثیت سے ہندی آوازوں سے بہت زیادہ ہم آہنگ نہیں میرؔ کے دل کی تپش اور اقبال کے فکر کی روشنی بھی صوت کی اکائیوں کو فردوس گوش نہ بنا سکیں'' ۵

مثال کے طور پر اسی مضمون سے اخذ کردہ دو شعر ہیں ۔

حواشی :

۱ پروفیسر مغنی تبسم اردو زبان کے اصوات مقالہ فانی بدایونی۔ صفحہ نمبر (۳۱۴) (۳۱۵)۔

ڈاکٹر مغنی تبسم مقالہ فانی بدایونی صفحہ (۳۱۰) ۔

۲ ڈاکٹر مسعود خاں مضمون مطالعہ شاعر اُردو میں لسانی تحقیق مضمون مطالعہ شاعر صفحہ (۳۱۵)۔

۳ ڈاکٹر مسعود خاں اُردو میں لسانی تحقیق مضمون مطالعہ شاعر صفحہ (۳۲۳)

۴ ڈاکٹر عبدالستار ردلوی اردو میں لسانی تحقیق صفحہ نمبر (۴۳۶)

۵ ڈاکٹر عبدالستار ردلوی اردو میں لسانی تحقیق صفحہ نمبر (۳۳۵)

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ
کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ

(میرؔ)

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

(اقبالؔ)

اسی طرح جہاں دار افسؔر نے اپنی غزلوں کی ردیف تاریخ اور چراغ قرار دیا ہے۔ یہاں ''خ'' اور ''غ'' کی چیستانی صورت ہندی آوازوں سے ہم آہنگ نہیں ایک اور غزل جس کا مطلع ہے۔

بعض لوگوں سے جو ہم از رہ تحقیق ملے
دشمن صدق وصفا تام کے صدیق ملے

اس غزل میں قافیے تحقیق ۔صدیق'تصدیق' توثیق'توفیق' استعمال کئے گئے ہیں۔ اور ردیف ملے ۔یہاں 'ق' لہاتی غیر مسموع اور (م) مسموع ہے اس لحاظ سے اس غزل میں قافیہ کا صوتی آہنگ ہلکا اور ملے کا صوتی آہنگ کھل کر پڑھا جاتا ہے اسکے علاوہ 'ق' کی چستاتی صورت بھی ہندی آوازوں سے ہم آہنگ نہیں ۔جن غزلوں میں جہاں دار افسؔر نے لانبے اور چھوٹے مصوتوں کو استعمال کیا ہے وہ صوتی آہنگ کے اعتبار سے موسیقیت کی چاشنی لئے ہوئے ہیں ۔ڈاکٹر مسعود حسین خان اپنے مضمون مطالعہ شعر میں لکھتے ہیں ۔اُردو حروف صحیح مسموع اور غیر مسموع آوازوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں ۔تمام حروف علت مسموع آوازیں ہیں اور موسیقی کی جان ہیں ۔ان کے علاوہ

گ ۔گھ ۔ج ۔جھ ۔ڈ ۔ڈھ ۔د ۔دھ ۔ ب ۔ بھ ۔
م ۔ غ ۔ ژ ۔ ڑ ۔ ڑھ ۔ ر ۔ ق ۔ ل ۔ و

مسموع حروف صحیح ہیں اور شاعر تانوں بانوں میں کل دس حروف علت اور بائیس حروف صحیح کل بتیس مسموع آوازیں ہیں ۔غیر مسموع آوازیں تعداد میں کل پندرہ ہیں ۔

ک ـ کھ ـ چ ـ چھ ـ ت ـ تھ ـ ب ـ بھ ـ خ ـ ش ـ س ـ ف ـ ہ

ان آوازوں سے ہماری شاعری میں صوتی وادیاں بنتی ہیں ۔ کیونکہ موسیقی کی بنیاد مسموع آوازوں بالخصوص حروف علت پر ہوتی ہے ۔ گلے کے پردوں کے زیر و بم میں تمام راگوں کے امکانات پوشیدہ ہیں ۔ غنائی شاعری کی حیثیت سے غزل موسیقی سے قریب ترین ہے اس لئے غزل میں جس قدر غنائیت ہوگی حروف علت کے بعد ترجیح مسموع حروف صحیح کو دی جائے گی ۔ اور غیر مسموع آوازوں کا تناسب عام طور پر ۱/۳ سے زیادہ نہیں ہوگا ۔ مثال کے طور پر میر یا غالب کی مشہور نغمہ ریز غزلوں کا جائزہ لیجیے ۔

(۱) ع ۔ اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

(۲) ع ۔ نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے

تو حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں ۔ ہر صورت میں حروف علت کی تعداد سب سے زیادہ ملتی ہے ۔ اس کے بعد مسموع حروف صحیح آتے ہیں ۔ اور سب سے آخر میں غیر مسموع اور غیر مسموع والوں کا اتصال بہ مشکل ملے گا ۔ جبکہ مسموع مرکب بھی آتے ہیں عام طور پر غنائی ردیفیں ا ۔ و ۔ ی سے مرکب ہوتی ہیں یا (ر) اور (ل) سے غیر مسموع حروف کی ردیفوں میں اساتذہ نے کہا ضرور ہے مثلاً ۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ

اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

مگر (ر) کے ارتقاء میں (ی) کی عدم موجودگی کی وجہ سے رواں نہیں ہوتیں ۔ حروف علت والی ردیفوں میں یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ انہیں موسیقی کی ضرورت کے مطابق کھینچ کر بھی پڑھا جا سکتا ہے چنانچہ عام طور پر ہمارے اساتذۂ غزل سے اچھا اور زیادہ ا ۔ و ۔ ی کی ردیفوں میں کہا ہے ۔ حرف علت کی کمی و بیشی شعر کی کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ چھوٹی یا طویل بحروں میں حزن و یاس کی کامیاب ترجمانی کا انحصار بہت کچھ حروف علت کی کثرت پر ہوتا ہے ۔ غالب کی دو مشہور غزلوں میں ۔

(۱) دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(۲) کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

حروف علت اور صحیح کا تناسب (۵۰) فی صدی کا ہے اس کے برعکس انکی فکر یہ غزل ۔

بس کے دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

میں حروف کا تناسب گھٹ کر (۴۰) فیصدی رہ جاتا ہے۔ مذکورہ بالا غزلوں کا صوتیائی تجزیہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جب جذبہ دل کی آنچ بن کر برآمد ہوتا ہے تو وہ حروف صحیح کی رکاوٹوں کو کم سے کم قبول کرتا ہے۔ موجودہ تنقید میں اس قسم کی تاثراتی اصطلاحات اور ترکیب کے جواز کہ میرؔ کی شاعری کا لہجہ مدھم ہے غالبؔ بلند بانگ انداز میں نغمہ سرا ہوتے ہیں صرف یہی ہو سکتا ہے کہ میرؔ طویل حروف (ا۔و۔ی) بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اس درجہ کہ کوز آوازوں کے روڑے تک اِن کے آہنگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس غالبؔ کوز آوازوں سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے وہ فارسی اور صوتیاتی آہنگ کے چلتے سُروں میں گاتے ہیں۔ پھر چلتے سُروں کی صوتیاتی توجیہ یہ ہے کہ وہ عربی۔ فارسی چستانی آوازوں (رگڑ کے ساتھ پیدا ہونے والی آوازیں) مثلاً
ج۔ش۔ف۔ر وغیرہ سے اپنا صوتیاتی آہنگ تیار کرتے ہیں۔ اور بیشتر انھیں (ن۔م) کی انفی موسیقی کا پس منظر عطا کرتے ہیں۔ یہی آہنگ اقبالؔ کا ہے۔

اس طویل بحث کی روشنی میں جہاں دار افسرؔ کی غزلوں کا مطالعہ کریں تو انھوں نے اپنی غزلوں میں جن کے مطالع ذیل میں درج کئے گئے ہیں ان غزلوں میں حروف علت کو مختلف بحور و اوزان میں استعمال کر کے اور موقع و محل سے حروف صحیح کی تعداد کا خیال رکھتے ہوئے موسیقیت کی ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ یہاں اُن کے غزلوں کے مطلعے درج کئے جاتے ہیں جن کے حروف علت کا کثرت سے استعمال ہوا ہے بعض غزلوں میں انفی مصمتے بھی شامل ہیں جن سے غزل کی دلاویزی میں اضافہ ہوا ہے ۔

(۱) غم کا جو ہو شعور تو غم بھی نجات ہے
حساس آدمی کی خموشی بھی بات ہے

(۲) دل کا مسیحا چارہ گر جاں کوئی تو آئے
لے کر ہمارے درد کا درماں کوئی تو آئے

(۳) میں نے ہر دم اسے دعا دی ہے
جس نے دنیا مری مٹادی ہے

(۴) زندگی لاکھ موت سی ہے میاں
زندگی پھر بھی زندگی ہے میاں

(۵) ہر اک آفت کا رستہ بن گیا ہوں
خدا جانے کہاں ٹھہرا ہوا ہوں

(۶) کلی نہ پھول نہ غنچے تلاش کرتے ہیں
ہم تو آپ کا رخِ زیبا تلاش کرتے ہیں

(۷) کوئی کافر کوئی دیں دار یہاں ہوتا ہے
ڈھونڈتا ہوں مگر انساں کہاں ہوتا ہے

(۸) مری راہ محبت میں اک ایسا بھی مقام آیا
مری آنکھوں میں آنسو آگئے جب ان کا نام آیا

(۹) اندھیرے کیوں نہ ہو مرعوب لوگو
اجالوں کے ہیں ہم مندوب لوگو

(۱۰) جب بھی کبھی فرزانے آئے
یاد ہمیں دیوانے آئے

(۱۱) خوشی کے سانچے میں ہم نے غموں کو ڈھالا ہے
ہماری زیست کا انداز ہی نرالا ہے

(۱۲) پھر بہار آتی ہے پھر عید ہے دیوانوں کی
خوب ہوتی ہے مدارات گر یبانوں کی

(۱۳) شعور زیست ہے جن کو نہ غم شناسی ہے
وہ پوچھتے ہیں یہی مجھسے کیوں اداسی ہے

(۱۴) وہ تیرگی ہے کہ اب روشنی بھی زخمی ہے
فروغ جہل سے دانش وری بھی زخمی ہے

الغرض جہاں دار افسر نے اپنے کلام میں صوتی آہنگ کومختلف انداز سے ابھار کر کہیں روانی، کہیں سادگی، کہیں نغمہ گی، کہں جمالیاتی کیف، کہیں عشق کی سرمستی۔اور کہیں وارفتگی اور کہیں ذوق جنوں کو پروان چڑھایا ہے جو ہر حیثیت سے یہ اُن کی کامیاب شاعری کی کھلی دلیل ہے۔

کسی شعر میں لفظوں سے پیدا ہونے والی آوازوں سے غنائیت اور موسیقیت کی فضاء قائم ہوتی ہے اس کا زیادہ تر انحصار شعر میں برتے جانے والے لانبے اور چھوٹے مصوتوں پر ہوتا ہے ڈاکٹر مغنی تبسم نے اپنے مقالے فانی بدایونی میں یہ تحریر کیا ہے کہ صوتی نقطۂ نظر سے فارسی اور اردو میں بحور کی موسیقی ان چار اجزا پر مشتمل ہوتی ہے۔

ا۔ لمبے مصوتوں کی زیادہ سے زیادہ گنجائش
۲۔ چھوٹے مصوتوں کی ناگزیر کم سے کم تعداد
۳۔ چھوٹے اور لمبے مصوتوں کی ترتیب
۴۔ مصوتوں اور مصمتوں کا تناسب [۱]

کسی شعر میں قافیہ اور ردیف کی اہمیت اس لئے ہوتی ہے کہ شاعر نے اس کو کس انداز سے برتا ہے اور ان میں کن حروف کو شامل کیا ہے جس سے دلآویزی کا اظہار ہو۔اس نظریۓ کے تحت ماہران صوتیات نے لکھا ہے کہ م ان ار ال جیسے بجتے ہوۓ مصمتے ہوں تو ردیف وقوافی زیادہ خوش آہنگ ہوتے ہیں۔یہ خیال شاعر کے دماغ میں غیر شعوری طور پر دل کے جذبات کے تحت پیدا

ہوتا ہے کہ وہ ایسے لفظ استعمال کرے، جس سے جاذبیت کا احساس جاگ اٹھے۔ اسی طرح مصوتوں کا مناسب اور زیادہ سے زیادہ استعمال شعر کے صوتی آہنگ میں موسیقت کا سبب ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ایک کامیاب شاعر کے، ہاں اُسکے میلان طبع کی مناسبت غیر شعوری طور پر اُبھر آتی ہے۔ اگر شاعر قصداً زیادہ سے زیادہ مصوتوں کی طرف اپنی توجہ کو مرکوز کرے گا تو اسکی شعریت نزاکت خیال سے محروم ہوجائیگی۔ اس لئے موزوں طبع کو ابتدأً نہ تو عروضی پیمانے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ تو صوتی آہنگ کے لئے لسانیت کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب کسی شاعر کے کلام کو تنقیدی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے گا تو اس کے لئے ان پیمانوں کو بھی ضرورت پڑے گی۔ اور معیاری نقطۂ نگاہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے کس حد تک کامیاب شاعری کی ہے۔

جہاں دار افسر کے کلام میں اس خصوصیت کو تلاش کرنے کی سعی ان کے مذاق سخن کے تحت علم صوتیات کے ایک پہلو پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ ہر وہ شعر جو موزوں ہوتا ہے اس کا تعلق فن عروض کی رو سے کسی نہ کسی مقررہ وزن میں ہوتا ہے۔ اور ہر شعر مصمتوں اور مصوتوں کی کمی وبیشی سے مزین ہوتا ہے۔ اور اس وزن کی صوتی مقدار کو ناپنے کے لئے ہم ایک ایسے پیمانے کو استعمال کرسکتے ہیں جس سے بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس لئے ہندی کی ماترائیں اور گرو سے مدد لی جائے گی۔ جہاں ہندی کی ماترا چھوٹے مصوتے کو ظاہر کرتی ہے تو گرو بڑے مصوتوں کیلئے مخصوص ہے اس کو علامتی زبان میں اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے۔

چھوٹے مصوتوں کے لئے علامتی ماترا = I صوتی مقدار (۱)

بڑے مصوتوں کے لئے علامتی گرو = S صوتی مقدار (۲)

صوتی اظہار کے لئے ہم ہندی کی ان علامتوں کو ارکان عشرہ یا افاعیل عشرہ میں اس طرح استعمال کرسکتے ہیں۔ افاعیل عشرہ کے جوڑ توڑ سے مختلف اوزان وجود میں آتے ہیں۔ اور ان کی مقررہ ترتیب سے بحر بنتی ہے جس کے، بلحاظ اوزان مختلف نام تجویز کئے گئے ہیں۔ عروضی نظام کے تحت ارکان عشرہ حسب ذیل ہیں۔

فعولن، فاعلن، فاعلاتن، فاع لاتن، مفاعیلن، متفاعلن، مستفعلن، مس تفع لن، مفعولات، مفاعلتن ان کی ماترائی شکلیں یہ ہوں گی

| | | | |
|---|---|---|---|
| فعولن ۔ | SSI | متفاعلن ۔ | SISII |
| فاعلن - | SIS | مستفعلن ۔ | SISS |
| فاعلاتن ۔ | SSIS | مس تفع لن۔ | SIIIS |
| فاع لاتن۔ | SSIS | مفعولات۔ | ISSS |
| مفاعیلن ۔ | SSSI | مفاعلتن ۔ | SIISI |

اس اصول کے تحت فعولن کو اگر ہم چار بار لکھیں تو بحر دائرہ مجتلبہ میں آئے گی اور اس کا نام بحر متقارب ہوگا۔اس بحر کی ہندی ماترا اور گرو یعنی چھوٹے اور لانبے مصوتوں کی شکل یہ ہوگی۔

بحر متقارب مثمن سالم۔ فعولن فعولن فعولن فعولن

SSI SSI SSI SSI

اس میں لانبے (8) اور چھوٹے مصوتے (4) ہیں۔لانبے مصوتوں کی صوتی مقدار (16) ہوگی۔ اور ایک مصرعے کی صوتی مقدار 16 + 4 = 20 ہوگی۔سالم شعر کی صوتی مقدار 40=20+20 ہوگی۔

اگر ہم جہاں دار افسر کے کلام کا صوتیاتی نظام کے تحت تجزیہ کریں تو مصوتوں کی صوتی مقدار کے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ جہاں دار افسر نے جن بحور میں غزلیں کہی ہیں وہ یہاں ترتیب وار درج کی جاتی ہیں۔

۱۔بحر ہزج مثمن سالم ۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

۲۔بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف ومحذوف۔ مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

۳۔بحر ہزج مثمن اشتر ۔ فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن

| بحر | ارکان |
|---|---|
| ۴۔ بحر ہزج مسدس عروض وصرب مخدوف باقی سالم | مفاعیلن مفاعیلن فعولن |
| ۵۔ بحر رمل مثمن عروض وضرب مقصور باقی سالم۔ | فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن |
| ۶۔ بحر رمل مثمن صدر وابتدا سالم عروض وضرب محذوف باقی مجنوں | فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن / فعِلن |
| ۷۔ بحر رمل مسدس عروض وضرب مقصور ۔ | فاعلاتن فاعلاتن فاعلن |
| ۸۔ بحر متقارب مثمن سالم ۔ | فعولن فعولن فعولن فعولن |
| ۹۔ بحر متدارک سولہ رکنی مخبوں مسکن ۔ | فعلن فعِلن فعلن فعِلن فعلن فعِلن فعلن فعِلن |
| ۱۰۔ بحر متدارک مختلف اوزان یہاں مثمن کا ایک وزن درج کیا جاتا ہے | فاع فعولن فعلن فعلن |
| ۱۱۔ بحر خفیف مسدس صدر سالم عروض وضرب محذوف مسکن مقصور | فاعلاتن مفاعلن فعلن / فعِلن |
| ۱۲۔ بحر مقتضب مثمن مطوی مسکن ۔ | فاعلات مفعولن فاعلات مفعولن |
| ۱۳۔ بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف مقصور | مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن |
| ۱۴۔ بحر مجتث مثمن عروض وضرب مخبوں محذوف مقصور مسکن | مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن / فعِلن |
| ۱۵۔ بحر جمیل مثمن سالم ۔ | مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن |

یہاں ہم جہاں دار افسر کی غزلوں کے مطلعوں کا صوتی تجزیہ کریں گے جس زمین میں انھوں نے اپنے فن کی جوت جگائی ہے۔ بحور کی تفصیل سلسلہ ماسبق میں دی جا چکی ہے اور اسی ترتیب

سے صوتیاتی نظام شعری کا جائزہ لیں گے۔

۱۔بحر ہزج مثمن سالم:-

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

صوتی مقدار SSSI SSSI SSSI SSSI

مصوتے
لانبے، 12
چھوٹے، 4

سالم شعر میں لانبے مصوتے 24

سالم شعر میں چھوٹے مصوتے 8 شعر میں صوتی مقدار 48+8=56

بحر ہزج میں جہاں دارافسر کی غزل کا مطلع ہے۔

مری راہِ محبت میں اک ایسا بھی مقام آیا

SSSI SSSI SIII SSSI

مری آنکھوں میں آنسو آ گئے جب اس کا نام آیا

SSSIII SISSSI SSSI

مصوتے
لانبے 20
چھوٹے 12

اس شعر کی صوتی مقدار 40+12=52

مذکورہ بحر میں مزید چار مصوتوں کی گنجائش تھی۔

۲۔بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف:-

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

اس بحر کی صوتی مقدار SSII SSI ISSI ISS

مصوتے
لانبے 8
چھوٹے 6

سالم شعر میں لانبے مصوتے 16

سالم شعر میں چھوٹے مصوتے 12

شعر کی صوتی مقدار 32+12=44

غزل کا مطلع ہے۔

دل آتے ہی ہونے لگا اظہار تمنا
SIIIS IIIS SII SI
کس موڑ پہ اب آ گیا معیار تمنا
SIIIS IIIS IIISI

مصوتے
لانبے 9
چھوٹے 19

سالم اس شعر کی صوتی مقدار 18+19=37

جہاں دار افسر نے اس غزل میں چھوٹے مصوتوں کو زیادہ استعمال کیا ہے۔

۳۔ بحر ہزج مثمن اشتر فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن
صوتی مقدار SSSI SIS SSSI SIS

مصوتے
لانبے 10
چھوٹے 4

سالم شعر میں لانبے مصوتے = 20
سالم شعر میں چھوٹے مصوتے = 8

بحر کی صوتی مقدار
40+8=48

جہاں دار کا افسر کا شعر۔

ہے بہار کا چرچا پھول بھی کھلے لیکن
SS SI SIS SIS ISIS
ہاتھ اپنے خالی تھے ہاتھ اپنے خالی ہیں
SSSS IIS SSSS IIS

مصوتے
لانبے 19
چھوٹے 9

شعر کی صوتی مقدار
38+9=47

۴۔ بحر ہزج مسدس۔ مفاعیلن مفاعیلن فعولن
صوتی مقدار۔ SSI SSSI SSSI

مصوتے
لانبے 8
چھوٹے 3

سالم شعر میں لانبے مصوتے =16
سالم شعر میں چھوٹے مصوتے =6

شعر کی صوتی مقدار 32+6=38

غزل کا مطلع سے

ہر اک آفت کا رستہ بن گیا ہوں
S S I I I I I I S I I
خدا جانے کہاں ٹھہرا ہوا ہوں
S SI SI SI SSSI

صوتے
لانبے 10
چھوٹے 12
شعر کی صوتی مقدار
20+12=32

۵۔ بحر رمل مثمن عروض وضرب مقصور باقی سالم

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن
SISSSIS SSIS SSIS

مصوتے
لانبے 11
چھوٹے 4

سالم شعر میں لانبے مصوتے =22
سالم شعر میں چھوٹے مصوتے =8

بحر کی صوتی مقدار
44+8=52

کیوں نہ ہو محبوب اپنا مشغلہ آوارگی
SISS I I I SI I SI SIS
دے رہی ہے اس کی محفل سے صدا آوارگی
S I S S S IS I I I I S S I S

مصوتے
لانبے 15
چھوٹے 15
شعر کی صوتی مقدار
30+15=45

۶۔ بحر رمل مثمن صدر وابتدا سالم عروض ضرب مجذوف باقی مخبوں

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن / فعِلن
SII/SS SSII SSII SSIS

مصوتے
لانبے 9 یا 8
چھوٹے 5 یا 7

شعر میں لانبے مصوتے =18 یا 16
شعر میں چھوٹے مصوتے =5 یا 7

بحر کی صوتی مقدار
+36 یا 32
5 یا 7
41 یا 39

پھر بہار آتی ہے پھر عید ہے دیوانوں کی

SSSS SISII SSSII

خوب ہوتی ہے مدارات گریبانوں کی

SSSSI ISSIS SSIS

مصوتے

لانبے 19

چھوٹے 9

شعر کی صوتی مقدار 38+9=47

۷۔ بحر رمل مسدس عروض وضرب مقصور

فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

SIS SSIS SSIS

مصوتے

لانبے 8

چھوٹے 3

بحر کی صوتی مقدار 32+6=38

دین و دنیا کی حقیقت کیا کہیں

SIS ISIS SIIS

اک حکایت ہے حکایت کیا کہیں

SIS ISI S I S I I

مصوتے

لانبے 11

چھوٹے 11

شعر کی صوتی مقدار 22+11=33

۸۔ بحر متقارب مثمن سالم

فعولن فعولن فعولن فعولن

SSI SSI SSI SSI

مصوتے

لانبے 8

چھوٹے 4

شعر میں بحر کی صوتی مقدار 16+8=24

32+8=40

شعر۔ ترے جی میں جتنا بھی آئے ستا لے

SSI SSI SII SSI

میں ثابت قدم ہوں مجھے آزما لے

SSISSI SII ISI

مصوتے

لانبے 13

چھوٹے 11

شعر کی صوتی مقدار

26+11=37

۹۔ بحر متدارک سولہ رکنی مخبون مسکن

فعلن فعِلن فعلن فعِلن فعلن فعِلن فعلن فعِلن

SII SS SII SS SII SS SII SS

مصوتے
لانبے 12
چھوٹے 8

شعر میں صوتی مقدار 24+16

48+16=64

شعر ہم شہر میں رہتے ہیں لیکن رہتے ہیں کدھر معلوم نہیں

S I I S I I I I S I I S S S I I I I I

ہے شہر کے ہر ایواں پہ نظر اور اپنا ہی گھر معلوم نہیں

S I I S I I I I I S I I I S S I I I I S

مصوتے
لانبے 12
چھوٹے 26

شعر کی صوتی مقدار 24+26=50

۱۰۔ بحر متدارک مثمن مختلف الاوزان

فاع فعولن فعلن فعلن

SS SS SSI IS

مصوتے
لانبے 7
چھوٹے 2

بحر میں مصوتوں کی تعداد 14+4 = 18

28+4=32

شعر جب بھی کبھی فرزانے آئے

S S S I S S I I I

یاد ہمیں دیوانے آئے

SS S SS SIIS

مصوتے
لانبے 12
چھوٹے 6

شعر کی صوتی مقدار

24+6=30

۱۱۔ بحر خفیف مسدس صدر سالم عروض وضرب مخذوف مسکن مقصور

فاعلاتن مفاعلن فعلن

SS SISI SSIS

مصوتے
لانبے 7
چھوٹے 3

شعر میں مصوتوں کی تعداد 14+6=20

صوتی مقدار 28+6=34

شعر ۔ میں نے ہر دم اُسے دعا دی ہے

S S SI SI I IIS

جس نے دنیا مری مٹا دی ہے

S S SI SI SII I

مصوتے
لانبے 10
چھوٹے 10

شعر میں صوتی مقدار 20+10=30

۱۲۔ بحر مقتضب مثمن مطوی مسکن

فاعلات مفعولن فاعلات مفعولن

SSS ISIS SSS ISIS

مصوتے
لانبے 10
چھوٹے 4

صوتی مقدار 40+8=48

کیوں رواں ہیں آنکھوں سے قافلے بہاروں کے

SSSI SIS S SSI SIS

کیا قفس میں ہوتے ہیں تذکرے بہاروں کے

SSSI SII SSS I I I S

مصوتے
لانبے 18
چھوٹے 10

شعر کی صوتی مقدار 36+10=46

۱۳۔ بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مخذوف مقصور

مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن

SIS ISSI ISIS IS S

مصوتے
لانبے 8
چھوٹے 6

صوتی مقدار 32+12=44

شعر۔ اپنا وجود اصل میں اُن کا وجود ہے

S ISI S I IIISI SI

جن سے کہ کارگاہ جہاں کی نمود ہے

S ISI SSII SI SIS I

مصوتے

لانبے 12

چھوٹے 15

شعر کی صوتی مقدار 24+15=39

۱۴۔ بحر مجتث مثمن عروض وضرب مخبوں محذوف مقصور

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

SS SISI SSII SI SI

مصوتے

لانبے 8

چھوٹے 6

شعر میں لانبے مصوتے =16

شعر میں چھوٹے مصوتے =12

شعر میں صوتی مقدار 32+12=44

شعر۔ وہ تیرگی ہے کہ اب روشنی بھی زخمی ہے

SSII SIS III SISI

فروغ جہل سے دانشوری بھی زخمی ہے

SS II SIISI I IISI

مصوتے

لانبے 11

چھوٹے 16

شعر کی صوتی مقدار 22+16=38

۱۵۔ بحر جمیل مثمن سالم

مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن

SSISI SSISI SSISI SSISI

مصوتے

لانبے 12

چھوٹے 8

شعر میں لانبے مصوتے =24

شعر میں چھوٹے مصوتے =16

صوتی مقدار 48+16=64

| شعر | | مصوتے |
|---|---|---|
| بہار حسن چمن سلامت فروغ لعل و گہر سلامت | | |
| I SIII SIISI ISIII SIISI | | لانبے 11 |
| ہزار جلوے ہیں ہر قدم پر اگر ہو ذوق نظر سلامت | | چھوٹے 29 |
| I SIII SS III I IIIISI ISI | | |

شعر کی صوتی مقدار 22+29=51

جہاں دار افسرؔ نے جملہ (۱۵) اوزان میں غزلیں کہی ہیں جن کی تفصیل پہلے دی جا چکی ہے۔ اور انھوں نے کثیر الاستعمال بحروں ۲ میں صوتیاتی نظام کو حتیٰ الامکان برقرار رکھنے کی کوشش ہے جس کی وجہ سے اُن کی غزلوں میں سادگی، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے. اس کے علاوہ اکثر غزلیں موسیقیت اور نغمہ ریزی میں رچی بسی ہیں جس میں کہیں بلند آہنگ بھی ہے اور کہیں مدھم سُروں میں بہتے ہوئے جذبات کے دھارے بھی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے شعری آہنگ میں مصوتوں کا ایک دو بحروں کو چھوڑ کر مناسب انداز میں استعمال کیا ہے۔ اسکے علاوہ شاعر کے لئے بھی اپنی طبع موزوں کے لحاظ سے یہ چیز بھی اختیاری ہے کہ کسی بحر کو استعمال کرتے ہوئے لمبے مصوتوں کی جگہ چھوٹے مصوتے لاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں جتنے لمبے مصوتے کم ہوں گے مصمتوں کی تعداد اتنی ہی بڑھے گی لیکن مصوتوں اور مصمتوں کی مجموعی تعداد بحر میں فراہم کردہ گنجائش سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

<u>ردیف وقوافی</u> : جہاں دار افسرؔ کے کلام میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ انھوں نے ردیف اور قوافی کے ذریعے اپنی غزلوں کو خوش آہنگ بنانے کی کوشش کی ہے. ڈاکٹر علی احمد جلیلی کہتے ہیں

> ''غزل کے قوافی و ردیف بحر میں مصوتوں اور مصمتوں کی گنجائش فراہم کر کے صوتی آہنگ میں اضافہ کرتے ہیں اور الفاظ کے انتخاب میں شاعر کے رہنما بھی ہوتے ہیں۔ غزل میں ردیف کی حیثیت حرف آخر کی ہوتی ہے چنانچہ ایسی ردیفوں میں جو لانبے مصوتوں پر ختم ہوتی ہیں آہنگ زیادہ ہوتا ہے'' [۱]

---

[۱] ڈاکٹر علی احمد جلیلی فصاحت جنگ جلیلؔ صفحہ (۲۹۹)۔

مثال کے طور پر جہاں دار افسرؔ کی چند غزلوں کے مطلعے یہاں درج کیے جاتے ہیں جن میں مصوتوں کی تعداد تین اور چار ہے۔

۱۔ تمنا' آس' حسرت آرزو ارمان بکتے ہیں ۳ مصوتے
یہ سب کیا چیز ہے اس دور میں ایمان بکتے ہیں ۴ مصوتے

۲۔ وہ تیرگی ہے کہ اب روشنی بھی زخمی ہے ۴ مصوتے
فروغ جہل سے دانشوری بھی زخمی ہے ۴ مصوتے

۳۔ شعور و علم کے پیکر جو ہم نے دیکھے ہیں ۵ مصوتے
کہاں ہے اب وہ سمندر جو ہم نے دیکھے ہیں ۵ مصوتے

بعض غزلیں جہاں دار افسرؔ نے ایسی بھی کہی ہیں جن میں طویل ردیفوں میں چار یا پانچ لفظ موجود ہیں۔ اور ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسمیں قافیہ کو بطور اسم اور ردیف کو بطور فعل استعمال کیا گیا ہے مثلاً۔

شعور و علم کے پیکر جو ہم نے دیکھے ہیں ۴ مصوتے
کہاں ہیں اب وہ سمندر جو ہم نے دیکھے ہیں ۳ مصوتے

ردیف پانچ لفظوں میں بطور فعل اور قافیہ پیکر' سمندر بطور اسم استعمال کیے گئے ہیں۔ اور یہ خوبی مطلع سے مقطع تک موجود رہے۔

اس طرح ایک دوسری غزل جس میں ردیف میں تین لفظ تلاش کرتے ہیں: کا استعمال ہوا ہے۔

کلی نہ پھول نہ غنچہ تلاش کرتے ہیں
ہم آپ کا رخ زیبا تلاش کرتے ہیں

اس میں ردیف تلاش کرتے ہیں بطور فعل تین لفظوں میں اور قافیے غنچہ اور رخ زیبا بطور اسم کے استعمال کیا گیا ہے۔ مصرع ثانی میں قافیہ رخ زیبا اور اسم مع صفت ہے۔ ایک اور غزل ہے جس میں ردیف کے پانچ لفظ استعمال کیے گئے :

مثلاً ؎

دل خوں گشتہ کا غم سے کوئی رشتہ نہ رہا
زندگی کیا ترا ہم سے کوئی رشتہ نہ رہا

بعض غزلوں میں جہاں دار افسر مصمتوں کے بغیر صرف مصوتوں کے اتصال سے صوتی آہنگ، جاذبیت اور حسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے اس شعر میں

میں نے ہر دم اسے دعا دی ہے
جس نے دنیا مری مٹا دی ہے

اس میں تین تین مصوتے ایک ساتھ استعمال کئے گئے ہیں ذیل کے شعروں میں بھی تین تین مصوتوں کو ایک ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔

کوئی کافر کوئی دیں دار یہاں ہوتا ہے
ڈھونڈتا ہوں مگر انساں کہاں ہوتا ہے

شعور زیست ہے جن کو نہ غم شناسی ہے
وہ پوچھتے ہیں یہی مجھ سے کیوں اُداسی ہے

اسی طرح ایک اور غزل ہے جس میں دو مصوتوں کا استعمال ہے۔

اندھیرے کیوں نہ ہو مرعوب لوگو
اجالوں کے ہیں ہم مندوب لوگو

اس غزل میں چار اور پانچ مصوتے ایکساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔

جب بھی کبھی فرزانے آئے
یاد ہمیں دیوانے آئے

اس غزل میں چار مصوتے ایک ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔

پھر بہار آتی ہے پھر عید ہے دیوانوں کی
خوب ہوتی ہے مدارات گریبانوں کی

اس طرح صوتی آہنگ کے لئے جہاں دار افسر نے مختلف انداز سے ردیف وقوافی میں ایک کامیاب شاعری کے جوہر دکھلائے ہیں۔

# جہاں دار افسر کا غیر مطبوعہ کلام

## ایٹم بم اور انسان

وزیر اعظم برطانیہ کی رفیقہ حیات ''مسز مری ولسن'' کی یہ نظم جو ایٹم بم کی تباہ کاریوں سے متعلق ہے سویت یونین کے اخبار ''ازویستا'' میں شائع ہوئی تھی لندن میں سیاست کے نمائندہ خصوصی جناب نصیر اختر صدیقی نے جب ''مری ولسن'' سے ''روزنامہ سیاست'' میں اس کے اُردو ترجمہ کی اجازت طلب کی تو انھوں نے بڑے ہی شوق سے اشاعت کی اجازت دیدی' اس نظم کا منظوم ترجمہ جناب جہاں دار افسر نے کیا ہے ہم نظم اور ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ سیاست)

## .: The Image of God :-

*(By: Miss Marie Wilson)*

After the bomb had fallen,
After the last sad cry,
When the earth was aburnt_out cindr,
Drifting across the sky,
Came lucifer, son of the morning,
With his fallen-angel hand,
Silent and swift as a vulture,
On a mountain top to stand.
And he looked, as he stoed on the mountain,
With his seadet wings unfuded,
At the channel-house of london,
And the cities of the world,
And he laughed..............,
And as that mocking laughter,
Across the Heavens ran,
He cried look the fallen angels,
"This is the work of man
Who was made in the image of god."

صاحب زادہ میر جہاں دار علی خاں افسر کے تسمیہ خوانی کی ایک
یادگار تصویر



صاحب زادہ میر جہاں دار علی خاں افسر کے ہدیہ کلامِ مجید
کے موقع پر لی گئی ایک یادگار تصویر ۱۹۲۹ء



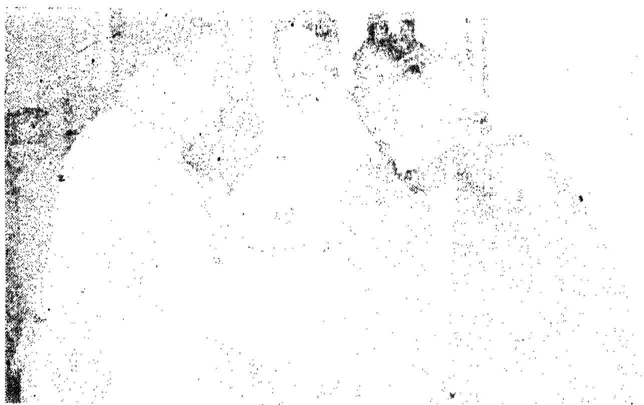
اردو ہال میں پروفیسر حبیب الرحمٰن، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر علیم۔ پروفیسر احتشام۔ عابد علی خاں اور ڈاکٹر گوڑ کے ساتھ سلیمان اریب، ابن احمد تاب، قمر ساحری، ناصر کرنولی، جہاں دار افسر، لاہوتی، جیلانی بانو اور آمنہ ابوالحسن وغیرہ



صاحب زادہ میر جہاں دار علی خاں افسرؔ پوتے میر سرفراز علی خاں اور پوتی کے ساتھ

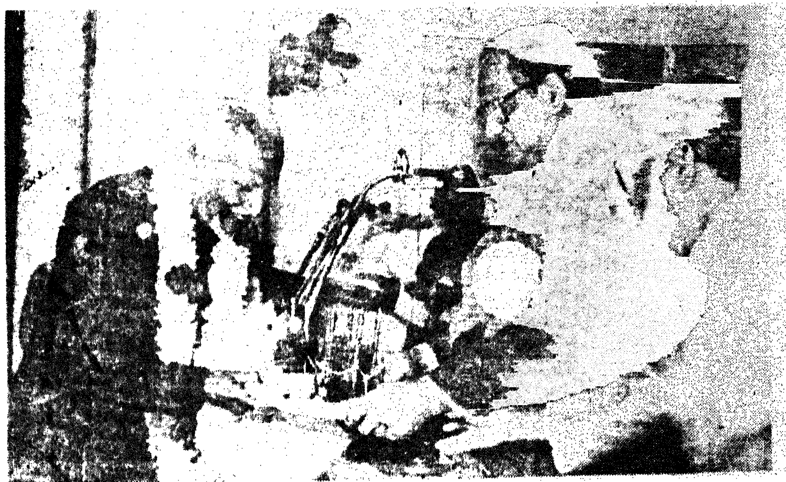


اردو گھر میں جلسہ اعتراف خدمات کا ایک منظر: جناب زاہد علی خان، ایڈیٹر 'سیاست' کیسہ زر پیش کرتے ہوئے ۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، منوہر راج سکسینہ، کے۔ ایل مہندرا، اور پروفیسر غیاث متین دیکھے جاسکتے ہیں۔



اردو اکاڈیمی کی جانب سے صحافتی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ کی پیشکشی پر جناب این، ٹی، راما راؤ (وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش) جہاں دار افسر کو مبارکباد دیتے ہوئے۔

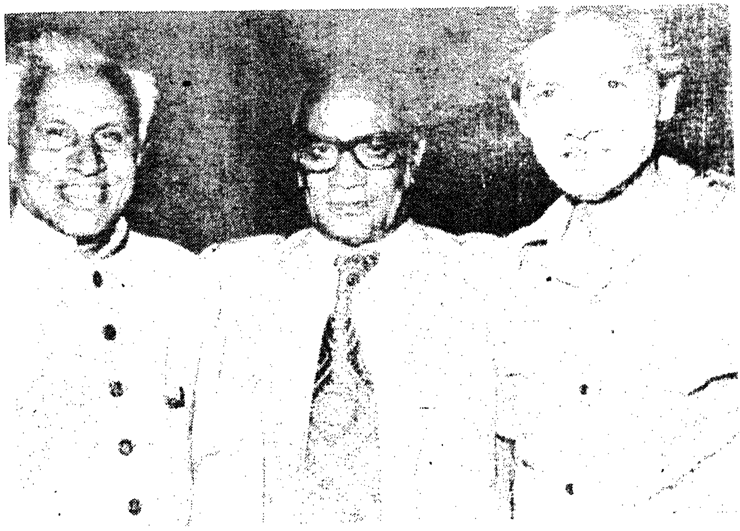
شہزادی عیسین (بیگم شہزادہ مفخم جاہ) جہاں دار افسر سے پرانے شہر کے مسائل پر بات چیت کرتے ہوئے۔



سابق چیف جسٹس آندھرا پردیش ہائی کورٹ جسٹس صغیر احمد جوبلی ہال میں جناب جہاں دار افسر کو ان کی مجموعی خدمات پر اردو اکاڈیمی کا ایوارڈ پیش کرتے ہوئے۔



صدر تلگو دیشم پارٹی مسٹر این۔ٹی۔راما راؤ اپنی پارٹی کی کامیابی کے بعد پہلی صحافتی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ۔تصویر میں جناب جہاں دار افسر اور دیگر صحافی دیکھے جاسکتے ہیں۔



سری نواس لاہوٹی کے ساتھ پروفیسر شہریار اور جہاں دار افسر



تصویر میں دائیں سے احسن علی مرزا، بشیر انور، محبوب نارائین، جہاں دار افسرؔ، علامہ نجم آفندی،
حضرت تاج قریشی، پروفیسر حسن عسکری، وقار خلیل، ذہانت علی بیگ اور دوسرے



دائیں سے بائیں : جہاں دار افسرؔ، قادری، نصرت محی الدین، حسن فرخ،
صاحبزادہ میر امتیاز علی اصغر، تاج کریم نگری، عامر خاں

﴿ترجمہ﴾

خطۂ ارض پر ایٹمی بم گرایا گیا

چیخ اٹھتی ہوئی سینۂ ارض میں

یک بیک جیسے تھم سی گئی

ایک نمناک افسردگی

جیسے جھلسی ہوئی سرزمیں

اک بگولے کے مانند اڑنے لگی

جانبِ آسماں

اک فرشتہ سحر کا دکھائی دیا

جسکے نازک پروں پر تھی افسردگی

تھا وہ خاموش بھی برق رفتار بھی

اک عقابی پرندہ کے مانند وہ

اک پہاڑی کی چوٹی کی جانب چلا

اور پہاڑی کی چوٹی سے

نیلے حسیں پر سمیٹے ہوئے

اس نے ڈالی نظر

شہر لندن کی فوجی عمارات پر

ساری دنیا کے شہروں کے حالات پر

اور جب قہقہہ وہ لگانے لگا

قہقہہ ایک تضحیک کا قہقہہ

آسمانوں کی پنہائیاں گونج اٹھیں

وہ بلندی سے گرتے ہوئے

اور فرشتوں کو آواز دیتے ہوئے

چیخ اُٹھا

دیکھو شہکار ہے یہ اُس انسان کا

جو بنایا گیا تھا بہ شکل خدا

شبیہ خدا

# غزلیات

## غزل

آنکھوں میں جم گیا کبھی دل میں اتر گیا
نقشہ کسی کے حسن کا کیا کام کرگیا

وہ آتے آتے گھر مرے غیروں کے گھر گیا
افسوس ہیکہ نالہ مرا بے اثر گیا

وعدے کا دن عجیب طرح سے گزر گیا
وہ میرے گھر کو آیا تو میں اس کے گھر گیا

غمخوار کس کو جانیئے کہئیے کسے رفیق
پہلو سے دل نہ جاتا تھا میرا مگر گیا

کیا کہیے گزرا کس طرح عالم شباب کا
دریا کی طرح جوش پہ آیا اتر گیا

فرماتے ہیں وہ مجھ سے لپٹ کر یہ خواب میں
اب درد دل گیا میرا درد جگر گیا

کیا پردۂ خیال میں تو چھپ گیا نہیں
آیا تھا وہ ابھی مرے دل میں کدھر گیا

وہ بھولے بن کے پوچھ رہے ہیں یہ غیر سے
محفل سے میری دیکھو وہ کیا بد نظر گیا

اے یادِ روئے یار بس اب گلفشانیاں
افسرؔ کا آج دامنِ امید بھر گیا

# غزل

خلق کی چشم عنایت پہ ہنسی آتی ہے
ساتھ ہی طرزِ عداوت پہ ہنسی آتی ہے
ایک بھی تار گریباں میں نہیں رکھا باقی
پھر بھی تجھ کو میری وحشت پہ ہنسی آتی ہے
منع کرتا ہے جوانی میں مجھے پینے سے
مجھ کو ناصح کی نصیحت پہ ہنسی آتی ہے
ایک بیکس کے نشمین کو جلایا تو نے
برقِ تاباں تری جرأت پہ ہنسی آتی ہے
دیکھنے آئے ہو بیمار کو بعدِ مُر دن
آپ کی ایسی عیادت پہ ہنسی آتی ہے
رونا آتا تھا کبھی ذکرِ محبت سن کر
اب مجھے ذکرِ محبت پہ ہنسی آتی ہے
مجھ سے مختار کو مجبور کیا خوب کیا
عشق کی شانِ کرامت پہ ہنسی آتی ہے
کیا کوئی میرے سوا عشق میں محصور نہیں
خلق کو کیوں مری حالت پہ ہنسی آتی ہے
سن کے اشعار وہ افسرؔ کے یہ فرماتے ہیں
تیرے اشعار کی شہرت پہ ہنسی آتی ہے

# قطعات

رُخ کی تابندگی پہ مرتے رہے
حسن کی سادگی پہ مرتے رہے
آنکھ بھر کے نہ دیکھنے والے
عمر بھر ہم تجھی پہ مرتے رہے

***

گر یونہی نظر آئے نہ صورت تیری
گر یونہی ستاتی رہے فرقت تیری
مر جاؤں گا اک روز ترے ارماں میں
لے جاؤں گا دنیا سے محبت تیری

***

# جہاں دار افسر کی صحافتی خدمات

جرنلزم یا صحافت اخبار نویسی کو کہتے ہیں عربی میں اس کے لئے ''جریدہ'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ صحافت کا زندگی سے اور زندگی کا ادب سے چولی دامن کا ساتھ ہے مشہور ادیب و ڈراما نگار جارج برناڈ شاہ کا بیان ہے کہ اعلیٰ ادب اور بلند پایہ ادبی شہ پارے درحقیقت صحافت ہیں۔(All great literative is journalism)ادب زندگی کا ترجمان ہے اور صحافت کا انسانی جذبات واحساسات سے گہرا تعلق ہے۔ زندگی واقعات کے گردوپیش سے اپنا واسطہ نہیں توڑ سکتی۔ طاقت، قوت اور اثر میں صحافت کو پارلیمنٹ کے مماثل قرار دیا گیا ہے۔ اکثر ادیبوں نے ابتداء اخباروں اور رسالوں کے لئے مضامین لکھنے شروع کئے اور بعد میں ان کی تحریروں کو ادبی اہمیت حاصل ہوئی۔ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جرمن، وغیر میں ہی نہیں ہندوستان میں بھی ایسے بے شمار صحیفہ نگار ملیں گے جنھوں نے صحافت کے ذریعہ ہی ادب اور سیاست میں نمایاں شہرت اور کامیابی حاصل کی خود اُردو زبان کے متعددا دیبوں، شاعروں، اور نقادوں کا صحافت سے گہرا تعلق رہا ہے صحافت کے ذریعہ ہی انھیں شہرت اور عزت ملی! سرسید کے تہذیب الاخلاق، ظفر علی خان کے زمیندار، محمد علی جوہر، کے ہمدرد، ابوالکلام آزاد کے الہلال والبلاغ، حسرت موہانی کے اُردوئے معلیٰ نیاز فتح پوری کے نگار، مولانا عبدالماجد دریابادی کے سچ اور صدق جدید قاضی عبدالغفار کے پیام اور اسی طرح کے متعدد اخبارات اور سینکڑوں جریدے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے دور میں ذہن اور زبان کی پرورش میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔

ان صحیفوں کا باقاعدہ مطالعہ کرنے سے ایک بات کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان پرچوں نے زندگی کے تمام شعبوں کی نمائندگی کی ہے۔ ان میں ادب کے ساتھ ساتھ، معاشی، اقتصادی، تاریخی، جمالیاتی، سائنسی، سیاحتی، تہذیبی، تمدنی، اور معاشرتی، موضوعات پر ان گنت مضامین موجود ہیں دراصل زبان کے فروغ کا سلسلہ خیالات اور افکارِ جولانی سے جوڑا ہوا ہے [۲]

ان اخبارات اور رسائل نے صحافتی وادبی حیثیتوں سے اُردو زبان وادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور اُردو ادب کو نئے مزاج سے روشناس کیا ہے اُردو کے ممتاز شاعر جہاں دار افسرؔ بھی صحافت کے ذریعہ ہی ادب میں آئے اور نمایاں مقام حاصل کیا آج صحافت ہی انکی گزر بسر کا ذریعہ ہے۔

**جہاں دار افسر کے صحافت میں آنے کی وجوہات:** جہاں دار افسرؔ حیدر آباد کے مشہور مدرسہ عالیہ میں جب زیر تعلیم تھے اُس وقت ان کا قیام عالیہ بورڈ ینگ ہاوس میں تھا۔ اس زمانے میں اُردو کے ممتاز ادیب و دانشور میر حسن ایم۔ اے (عثمانیہ) بورڈ ینگ ہاوس کے انچارج تھے وہ ترقی پسند افکار و خیالات کے آدمی تھے۔ اُنھیں سے تعلیم دلوانے کے لئے حکومت حیدر آباد کے ایک وزیر تعمیرات نواب زین یار جنگ نے اپنے فرزند سعادت علی خاں کو عالیہ بورڈ ینگ ہاوس میں شریک کروایا تھا۔ ہاوس میں شریک کروایا تھا۔ یہ سعادت علی خاں آزادی ہند کے بعد مختلف مما لک میں سفیر ہند اور جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان کے پارلیمنٹری سکریٹری بنے میر حسن سے کامریڈ مخدومؔ محی الدین کا گہرہ یارانہ تھا وہ ہر روز ان سے ملنے بورڈ ینگ ہاوس آتے تھے۔ مخدومؔ محی الدین کی ساتھ صاحبزادہ میکشؔ، ظفر الحسن، اشفاق حسین اور شہاب الدین وغیرہ بھی بورڈ نگ ہاوس آتے رہتے تھے۔ یہ سب جامعہ عثمانیہ کے دور زرین کے طلبا اور فارغ التحصیل لوگ تھے۔

مخدومؔ محی الدین بحیثیت شاعر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ میکشؔ کی شاعری کی بھی بڑی دھوم تھی۔ ان لوگوں کی سیاسی باتیں ادبی تبصرہ سننے سے تعلق رکھتے تھے عالیہ بورٹینگ ہاوس کے جونیر طلباء جن میں جہاں دار افسرؔ بھی پیش پیش ہیں سعادت علی خاں کے کمرہ کے چکر لگاتے تھے تاکہ مخدومؔ و میکشؔ کی شاعری سن سکیں اور ان کے سیاسی تبصروں سے معلومات میں اضافہ کریں۔ بورڈ نگ ہاوس میں ہر صبح و شام preparation کلاس ہوتے میر حسن اِن کلاس کے انچارج بھی تھے۔ طلباء preparation classes میں مخدومؔ محی الدین اور میکشؔ کی سُنی ہوئی نظموں کے بارے میں میر حسن سے سوالات کرتے۔ میر حسن نے ڈانٹ کر ایک بار کہا تھا کہ یہ کلاس درسی کتب کے بارے میں ہوتی ہیں طلباء زائد از نصابی باتیں کیوں پوچھتے ہیں۔ ایک بار میر حسن نے کہا کہ یوں لگتا ہے کہ

جب ہم سعادت علی خاں کے کمرہ میں رہتے ہیں تو طلباء اِدھر اُدھر سے تاک جھانک کرتے ہیں۔ایک بار میر حسن نے جہاں دار افسؔر کا تعارف مخدوؔم محی الدین سے کروایا کہ یہ لڑکا آپ کی شاعری اور آپ کی باتوں سے دلچسپی رکھتا ہے۔میکشؔ نے آگے بڑھ کر کہا کہ میرا چچا زاد بھائی ہے۔ اس کے بعد سے مخدوؔم اور میکشؔ جہاں دار افسؔر کے ذہن کی اصلاح کرنے لگے۔سیاسی باتیں سمجھائی جانے لگیں اور انھیں مشورہ دیا گیا کہ وہ اُس زمانے کے ترقی پسند ہفتہ وار رسالہ ''تاج'' کا مطالعہ کیا کریں۔ ہفتہ وار تاج آگرہ ہوٹل گلزار حوض کے سامنے والے بنگلے سے نکلتا تھا۔جس کی ادارت صاحبزادہ میکشؔ اور ڈاکٹر حسینی شاہد کے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ جہاں دار افسؔر کا پہلا مراسلہ ۱۹۴۴ء میں اسی ہفتہ وار میں شائع ہوا تھا۔جسے وہ مہینوں بغل میں دبائے دوست احباب کو فخریہ انداز میں دکھاتے پھرتے تھے۔ جب رسائل اور اخبارات سے اُن کی دلچسپی بڑھی تو وہ اُس زمانے کے ترقی پسند اُردو روزنامہ ''پیام'' کا مطالعہ کرنے لگے جس کے مدیر قاضی عبدالغفار تھے۔ بعد میں اِس اخبار کے مدیر اختر حسن بنے۔ یہ اخبار سیکولر اور جمہوری خیالات کی اشاعت و تبلیغ میں پیش پیش تھا۔اسی اخبار سے شعر و ادب کا چسکہ اور بڑھا اور وہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے قریب ہونے لگے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کی دوران جتنے نامور ادیب' شاعر' اور دانشور تھے اُن سے جہاں دار افسؔر کے قریبی مراسم قائم ہوئے۔سلیمان اریبؔ' ڈاکٹر حُسینی شاہدؔ' سردار سلیمؔ' اقبال متینؔ' وہاب حیدرؔ' حامد علی قادری' کنول پرشاد کنوؔل وغیرہ سے روزانہ کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔

## جہاں دار افسؔر کی صحافت سے وابستگی:

پرانے شہر حیدآباد کے مشہور محلہ اعتبار چوک سے ۱۹۴۶ء میں روزنامہ ''نظام'' جاری ہوا۔ تو جہاں دار افسؔر اس اخبار کے جائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے وہ اس اخبار میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تک اداریہ لکھتے رہے۔مسٹر محمد علی خاں کلیم اس روزنامہ کے ایڈیٹر تھے۔ یہ روزنامہ دیوڑھی معزجنگ اعتبار چوک سے نکلا کرتا تھا۔ اِس اخبار کی پالیسی مخالف جاگیر شاہی تھی۔ چنانچہ اِس اخبار پر ہمیشہ نظام

شاہی راج پاٹ کا عتاب رہا۔ محکمہ اُمور داخلہ کے حکم سے اِس اخبار کے اداریوں پر احتساب عائد کیا گیا تھا۔ اور حکم ملا تھا کہ وزارت داخلہ ریاست حیدر آباد کی تصدیق کے بغیر کوئی اداریہ راست شائع نہ کیا جائے۔ چنانچہ ادارہ روزنامہ نظام نے فیصلہ کیا کے کوئی اداریہ معتمد داخلہ کے تصدیق و توثیق کے لیئے نہیں بھیجا جائے گا۔ بلکہ ہر روز اداریہ کی جگہ ایک طنزیہ شعر شائع کیا جائے گا۔ جس جاگیر شاہی پر چوٹ لگتی ہے۔ ایک بار اسی دوران ایک سرکاری تقریب میں اُس وقت کے صدر الہام (منسٹر) اُمور دستوری نواب علی یاور جنگ سے جہاں دار افسرؔ کی ملاقات ہوئی۔ تو اُنہوں نے کہا کے آپ کی اس نئی شرارت پر کیا کیا جائے۔ جس کے جواب میں جہاں دار افسرؔ نے کہا تھا۔ ''ظلم کے لئے ہاتھ دراز ہوتے ہیں مگر جہاں دار افسرؔ حق گوئی اور بے باکی کو ترک نہیں کرے گا'' ایک روز پولیس اسٹیشن کالی کمان کے انسپکٹر دفتر نظام آئے اور اطلاع دی کہ ایڈیٹر روزنامہ نظام اور اداریہ نویس کیلئے کوئی فرمان کنگ کوٹھی مبارک سے وزیر داخلہ نواب دین یار جنگ کے پاس آیا ہے۔ آپ عزیز باغ سلطان پورہ میں اُن سے مل لیجیئے اُس فرمان کی کاپی ہم کو نہیں دی گئی۔ فرمان میں جہاں دار افسرؔ کے نام کے بہ جائے (J.A.) کے الفاظ استعمال کیئے گئے تھے نواب دین یار جنگ بہادر سے جہاں دار افسرؔ کے والد میر افتخار علی خاں مرحوم اور خسر میر کفایت علیخاں مرحوم کے ذاتی اور شخصی مراسم تھے۔ کیونکہ یہ لوگ مدرسہ اعزاء میں ہم مکتب اور ہم جماعت رہے۔ اس لیئے نواب دین یار جنگ بہادر نے بہ حیثیت صدر نظام کوتوالی (ڈائرکٹر جنرل پولیس) جہاں دار افسرؔ سے کبھی نرم کبھی گرم گفتگو کی جس میں شفقت کا پہلو زیادہ تھا۔

جب اُنھوں نے جہاں دار افسرؔ سے کہا کہ آپ لوگ شہر بدر بھی کئے جاسکتے ہیں تو وہ یہ کہتے ہوئے عزیز باغ سے نکل گئے ۔

ملک خدا تنگ نیست
پائے گدا لنگ نیست

یہ مشہور فارسی مثل ہے کہ خدا کا ملک تنگ نہیں اور فقیر کا پاؤں لنگڑا نہیں کسی خاص مقام پر موقف نہیں ہر جگہ کوشش کرنے کا موقع ہے۔

## جہاں دار افسر نے مختلف نیوز سرویسوں میں کلیدی فرائض انجام دیئے:

جہاں دار افسر حیدر آباد کے مختلف خبر رساں ایجنسیوں سے وابستہ رہے اور گہرا صحافتی تجربہ حاصل کیا۔ وہ رحیم فریادی کے ساتھ پبلک نیوز سرویز میں کام کیا اور کلیدی فرائض انجام دیئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے پریس ایکسچنج میں بھی کام کیا جو حیدر آباد کے مشہور روزنامہ میزان کی نیوز ایجنسی تھی اس میں اسوسی ایٹ نیوس سرویس کے رضا علی اور سید یوسف الدین مرحوم کے ساتھ خبر رسانی کا کام کیا۔ جناب عبدالحق کاہش حیدآبادی، محمد علی عثمانی اور مرتضی مجتہدی سے بھی انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ جہاں دار افسر پولیس ایکشن سے پہلے جاگیر شاہی کی جگہ جمہوریت کے لئے جدو جہد کرنے والے صحافیوں کے ہم سفر و ہم قدم رہے اور پولیس ایکشن کے بعد اقلیتوں کے جمہوری حقوق کی خاطر جدو جہد کرنے والے کارکن صحافیوں اور ورکنگ جرنلسٹوں میں وہاب حیدر، غلام حیدر، شریف اسلم، سید یعقوب رحمت علی، احمد معظم، اسد جعفری، اور احسن علی مرزا کے ساتھ آزمائشی حالات میں بھی جہاں دار افسر نے قلمی جہاد جاری رکھا۔

## [illegible] نیوز ایجنسی:

جہاں دار افسر نے خود [illegible] نیوز ایجنسی کے نام سے اپنا ایک خبر رساں ادارہ کٹل منڈی نامپلی اسٹیشن روڈ پر قائم کیا تھا۔ جہاں ۱۹۷۰ء کے اوائل میں عطاء محمد اور دوسرے بہت سے نوجوان صحافیوں نے تربیت حاصل کی۔ عطاء محمد سینیر سب ایڈیٹر روزنامہ منصف حیدر آباد نے اپنے ایک انٹرویو میں مقالہ نگار کو بتایا کہ ۱۹۷۰ء میں جب میں نے گریجویشن تکمیل کی تھی۔ جناب افسر صاحب کی خواہش پر میں اور میرے دوست عارف علی دونوں انڈین نیوز سرویس سے وابستہ ہوئے یہ ایک حقیقت ہے کہ صحافتی میدان میں جناب جہاں دار افسر نے مجھے قلم پکڑنا سکھایا میں اس وقت صحافت کی ابجد

سے بھی واقف نہیں تھا افسر صاحب نے مجھے بتایا کہ پریس کانفرنس، عام جلسوں، انٹرویوز اور خصوصی خبروں وغیرہ کی رپورٹنگ کس طرح کی جاتی ہے کس کی تقریر، بیان یا واقعے میں سب سے اہم بات کی کس طرح lead لی جاتی ہے۔" آجکل جہاں دار افسر پیوپلز نیوز ایجنسی کے نام سے اپنا ایک خبر رساں ادارہ چلا رہے ہیں جو مغلپورہ کمان روبرو مسجد ساجدہ بیگم واقع ہے۔

## پولیس ایکشن کے بعد مختلف اخبارات سے وابستگی :

پولیس ایکشن کے بعد اُردو اخبارات پر بڑا برا وقت آیا ملٹری گورنر جے۔این چودھری نے کئی اخبارات بند کروا دیئے۔ بے شمار صحافی ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے۔ ان نامساعد حالات میں بھی جہاں دار افسر اُردو صحافت سے وابستہ رہے اور اقلیتوں اور دیگر پسماندہ طبقات کے جمہوری حقوق کی خاطر اپنی نوک قلم اور تیز کردی۔ پولیس ایکشن کے بعد انہوں نے حیدرآباد سے نکلنے والے تقریباً تمام اخبارات اور خبر رساں اداروں میں کام کیا۔ پولیس ایکشن کے فوری بعد "روز نامہ خورشید" کا اجراء عمل میں آیا جس کے ایڈیٹر سید شاہ غوث علی تھے یہ اخبار ترپ بازار سے نکلتا تھا۔ جہاں دار افسر اس اخبار سے وابستہ ہوئے اس کے علاوہ افضل گنج حیدرآباد سے شائع ہونے والے روز نامہ 'جوہر' جس کے ایڈیٹر غالب حیدرآبادی تھے۔ جہاں دار افسر اس روز نامہ میں بھی بحیثیت مضمون نگار اور مترجم کے کام کیے۔ روز نامہ "حق بات" سے بھی جہاں دار افسر وابستہ رہے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر محمد غفران، سابق نام شیخ چاند تھا۔ حیدرآباد کے قدیم روز نامہ "مشیر دکن" سے بھی جہاں دار افسر ایک مترجم کی حیثیت سے مامور رہے۔ اُس وقت اس اخبار کے ایڈیٹر واس دیو تھے اور یہ اخبار گولی گوڑہ سے شائع ہوتا تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد شائع ہونے والے اخبارات میں "ہمارا اقدام" بھی تھا جو مدینہ بلڈنگ سے شائع ہوتا تھا۔ جہاں دار افسر اس اخبار میں اداریہ لکھتے رہے جہاں دار افسر کے اداریوں پر اس اخبار کے ایڈیٹر شہر یار عابدی جیل کی ہوا کھاتے رہے یہی حشر "نیا زمانہ" کے ایڈیٹر احمد افسر کا بھی ہوا۔ ان کے اخبار میں بھی جہاں دار افسر اداریئے لکھا کرتے تھے۔

معین فارقی کے روزنامہ ''انگارے'' سے بھی جہاں دار افسر برسوں وابستہ رہے اور اداریہ لکھتے رہے۔ جہاں دار افسر روزنامے ''پیام'' سے اس وقت وابستہ ہوئے جبکہ اختر حسن اس کے اڈیٹر تھے۔ اور یہ اخبار اجنتا گیٹ سے شائع ہوتا تھا۔ ان اخبارات کے علاوہ شہر حیدرآباد اور مختلف اضلاع سے شائع ہونے والے کئی ہفتہ وار رسالوں میں بھی جہاں دار افسر نے اداریے اور مضامین لکھے یہی نہیں ان کے مضامین روزنامہ ''انقلاب'' بمبئی میں بھی بڑے اہتمام سے شائع ہوتے رہے ان کے مضامین اور اداریے بڑے پسند کئے جاتے اور ہندوستان بھر کے اخبارات میں ڈائجسٹ ہوتے رہے ہیں۔

## روزنامہ سیاست سے وابستگی :

جہاں دار افسر بے شمار اخبارات میں کام کرتے رہے آخر میں وہ روزنامہ سیاست حیدرآباد سے وابستہ ہوئے وہ سیاست میں سب ایڈیٹر اور رپورٹر کے عہدے سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہونے کے بعد آج بھی کوہ پیما کی حیثیت سے سیاست کا مشہور کالم ''شیشہ و تیشہ'' میں سوالات کے جواب دیتے ہیں۔

اُردو اخبار میں مزاح کا کالم ایک بہت بڑا ورثہ ہے۔ قاضی عبدالغفار نے اپنے روزنامہ پیام میں ''سرراہ'' سے اُردو اخبار کے مزاحیہ کالم کو ایک خاص مقام بخشا تھا یہ روایت روزنامہ سیاست نے بھی جاری رکھی۔ سیاست میں یہ کالم شاہد صدیقی' اوج یعقوبی اور مجتبیٰ حسین لکھا کرتے تھے اب یہ کالم جہاں دار افسر کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کالم کے متعلق سیاست کے جائنٹ ایڈیٹر محبوب حسین جگر کا بیان ہے کہ کوہکن کا تیشہ طنز و مزاح کے ادب میں لائق لحاظ حصہ رکھتا ہے [۳]

روزنامہ سیاست دراصل روزنامہ پیام کی پالیسی کی توسیع تھی بانی اخبار ایڈیٹر عابد علی خاں اور جائنٹ ایڈیٹر محبوب حسین جگر نے اردو صحافت کے وقار اور اعتبار کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے عابد علی خاں اور جگر صاحب کی جوڑی لاہور کے روزنامہ انقلاب'' کے عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر جیسی تھی گویا ایک جان دو قالب محبوب حسین جگر مرحوم نے بڑی دیدہ وری کے ذریعہ سیاست کو ایک مدت دراز تک ہندوستان کا سب سے معیاری اخبار بنادیا۔ جہاں دار افسر بھی عابد علی خاں اور محبوب حسین جگر کے ساتھ شریک قافلہ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ سیاست سے ان کا گہرا تعلق اب تک قائم ہے۔

## روزنامہ منصف میں کالم نگاری:

گزشتہ اکتوبر ۱۹۹۸ء سے جہاں دار افسر حیدرآباد کے مشہور روزنامہ ''منصف'' میں ایک کالم لکھ رہے ہیں ابتداء یہ کالم ''حیدرآباد دیدہ وشنیدہ مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا'' کے عنوان سے لکھتے رہے جو منصف کے اتوار کے ایڈیشن میں شائع ہوتا رہا۔ اس سلسلہ کی (۷۵) قسطیں شائع ہوئیں پھر اس کے بعد منصف کے جمعرات کے ایڈیشن میں ''آئینہ شہر'' کے سلسلہ میں ''چارمینار کے دامن میں'' کے عنوان سے کالم لکھ رہے ہیں۔ جس کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ یہ دونوں کالم خاصہ کی چیز ہیں۔ خصوصاً آخری الذکر کالم میں وہ بڑی بے باکی اور حق گوئی سے حالات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کی معتبر آواز توجہ سے سنی اور پڑھی جاتی ہے۔ مہاشہ کرشن نے صحافی کے فرائض کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ۔

''اخبار نویس خبر فروش یا ایک عام دوکاندار کی طرح نہیں ہوتا۔ اسکا خبریں بیچنے کا رنگ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کاز کیلئے اپنی زندگی وقف کر دیتا ہے۔ اس پر جبر واستبداد کے خلاف آواز بلند کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسے ہمیشہ مقہور و مجبور کی ترجمانی کرنی چاہیئے۔ اور ضرورت پڑنے پر اسے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے اس کا فرض ہے کہ وہ عوام کی تکلیفیں بیان کرے ان تکلیفوں کی نمائندگی کرے اور اگر حکومت ان پر توجہ نہ دے تو حکومت کے خلاف جدوجہد کا بگل بجادے'' [۴] جہاں دار افسر اس نظریے پر پورے اترتے ہیں

حواشی :

۱ ڈاکٹر افضل الدین اقبال: جنوبی ہند کی اُردو صحافت ص ۱۴ تا ۱۶ مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۸۱ء

۲ انور علی دہلوی: اُردو صحافت صفحہ (۲۵۳) مطبوعہ اُردو اکیڈیمی دہلی ۱۹۸۷ء

۳ محبوب حسین جگر: روشن خیالی اور رہنمائی کے نئے سفیر مطبوعہ جہاں دار افسر شخص اور عکس صفحہ نمبر (۱) مطبوعہ حیدرآباد

۴ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو روزنامہ پرتاب مورخہ ۱۱ اگسٹ ۱۹۵۷ء

# جہاں دار افسرؔ مشاہیر کی نظر میں

مشاہیر کی نظر میں جہاں دار افسرؔ کس مرتبے اور مقام کے حامل ہیں اس کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ ذیل میں کچھ مشاہیر کے آراء درج ہیں۔ جن سے انھیں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

۱) افسرؔ کی روشن خیالی اور روشن ضمیری قابل قدر ہے۔

جگرؔ مرادآبادی

۲) جہاں دار افسرؔ میرا قابل قدر شاگرد ہے۔ جس سے بڑی توقعات ہیں۔

صفؔی اورنگ آبادی

۳) افسرؔ نہ صرف جہاں دار ہے بلکہ جاندار اور شاندار بھی ہے۔

مخدومؔ محی الدین

۴) افسرؔ کام کو کام سمجھنے والوں میں جہاں دار شامل ہے۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن سابق معتمد انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش

۵) عوام کے جمہوری حقوق کے افسرؔ ہمیشہ نقیب رہے۔

عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست حیدرآباد

۶) عوامی زندگی میں پاکیزہ زندگی کی بہترین مثال جہاں دار افسرؔ ہیں۔

نواب میر احمد علی خاں. سابق وزیر داخلہ حکومت آندھرا پردیش

۷) تلنگانہ مسلح جدوجہد اور اس کے بعد افسرؔ نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا۔

ڈاکٹر جیسوریہ

۸) میں کانگریسی ہوں مگر کمیونسٹ میونسپل کونسلر جہاں دار افسرؔ کو ایک مثالی کونسلر مانتا ہوں۔

بیرسٹر شہاب الدین احمد خاں سابق میئر بلدیہ حیدرآباد

۹) جہاں دار افسرؔ حیدرآباد کی تبدیلیوں کے دور میں روشنی روشن خیالی اور رہنمائی کے سفیر ہیں!!

محبوب حسین جگر جائنٹ ایڈیٹر سیاست حیدر آباد

۱۰) جہاں دار افسر کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ لب پہ حرف غزل دل میں قندیل غم سے عبارت ہے۔ وہ مذہب، زبان علاقہ کی حد بندیوں اور تعصب و تنگ نظری سے ماورا خود میں انسانیت دوستی کا جذبہ رکھتا ہے۔ اس لئے اس کی مقبولیت بھی تمام حد بندیوں سے ماورا ہے۔ ایسے وسیع المشرب آدمی اب قال قال ہوتے جارہے ہیں۔ وہ قدیم حیدر آبادی تہذیب و اخلاق کی پہچان اور نئے جمہوری حیدر آباد کی شناخت ہے۔ اس کا تصور حیات آفاقی اور عالمی ہے۔ وہ ساری انسانیت کو جو حق، انصاف اور مساوات کے لئے کوشاں ہے۔ اپنا کنبہ مانتا ہے اور اس گروہ انسانی کا پرستار ہے۔ جو ستون دار پر سروں کے چراغ روشن کرتے چلتا ہے۔ تا کہ زندگی کی تمام مبارک، صالح اور اعلیٰ اقدار تابناک اور ضوفشاں رہیں۔[۲]

جسٹس سردار علی خاں
سابق صدر نشین قومی اقلیتی کمیشن دہلی

۱۱) جہاں دار افسر نے اپنی ساری زندگی پرانے شہر کے بارے میں سوچتے ہوئے گذار دی ہے۔ وہاں کی علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی زندگی میں مقدور بھر شامل رہے ہیں۔ بھلے ہی جہاں دار افسر کو یہ نہ معلوم ہو کہ موسیٰ ندی پر نیا پل اور چادر گھاٹ کا پل بن چکے ہیں۔ لیکن یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے پرانے شہر اور مختلف بر آعظموں میں رہنے والوں کی سچی دوستی، محبت، انسانیت اور پیار کے پل بنانے کی کوشش کی ہے۔[۳]

مجتبیٰ حسین

۱۲) جہاں دار افسر کے آبا و اجداد نے تخت شاہی پر بیٹھ کر حکومت کی اور جہاں دار بوریے پر بیٹھ کر حکمرانی کرتا رہا۔ ایک کا سکہ ریاست میں چلتا تھا۔ اور دوسرے کا عوام کے دلوں میں آج وہ سلاطینِ سلف سب نذرِ اجل ہو گئے نہ ان کی سلطنت باقی رہی اور نہ ان کا سکہ "رہے نام اللہ کا" لیکن عوام میں اس فقیر منش پاشا کی جہاں داری آج بھی قائم ہے اور اس کا سکہ بھی بفضل یزداں رائج الوقت

ہے..... جہاں دار کو اپنی زبان اور اپنی تہذیب سے بے پناہ محبت ہے۔ اُردو کی بقاء اور فروغ کے لئے وہ صرف فکر مند ہی نہیں بلکہ اس تحریک کا ایک مرد مجاہد بھی ہے۔ وہ چار مینار کو محض ایک عمارت نہیں بلکہ اپنی تہذیب کا ایک روشن نشان کئی نسلوں کا اثاثہ نئی نسلوں کا ورثہ اور طرح داروں کی امانت سمجھتا ہے اس کی نگاہِ پاک باز میں چار مینار اخلاص، اخلاق و مروت، رواداری اور سرافرازی کے مظہر ہیں اور اس کے کنگوروں سے بصیرت کے چراغ جلتے ہیں۔ ۴

مہدی عابدی

سابق مدیر حیات و سوریت جائزہ

۱۳) میرے نہایت پر خلوص کرم فرما دوست محترم و مکرم جہاں دار افسؔر جن سے میں کم و بیش تیس سال سے واقف ہوں ایک اچھے ادیب، اچھے شاعر اور ایک اچھے سنجیدہ معتبر صحافی ہیں وہ ایک نیک نفس اور شائستہ مزاج شخص کی حیثیت سے بھی ادبی اور سماجی حلقوں میں ہر دل عزیز ہیں۔ ۵

محمد منظور احمد

سابق لکچرار اُردو گورنمنٹ سٹی کالج

۱۴) میرے پرانے ساتھی جناب جہاں دار افسؔر ایک مقبول عوامی لیڈر نامور صحافی، اچھے مقرر اور صاحب دیوان شاعر ہونے کے علاوہ ایک پیارے اور مخلص دوست بھی ہیں۔ وہ ایک صاحبزادہ خاندان میں جنم لینے کے باوجود ان کا گہرا تعلق بائیں بازو کی تحریکوں اور کمیونسٹ پارٹی سے رہا۔ مغلپورہ میں ان کی رہائش گاہ ایک اچھی خاصی دیوڑھی تھی جو اب شائد باقی نہیں رہی اس حویلی کے چشم چراغ نے یہ نعرہ لگایا کہ۔

"آ اُنھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں"

جب بھی پرانے شہر اور وہاں کی عوامی تحریکوں کا ذکر آتا ہے تو جہاں دار افسؔر کی تصویر میرے ذہن میں اُبھر کر آتی ہے وہ پرانے شہر کی مشہور اور مقبول شخصیت ہیں۔ اُن کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے متحدہ شہری کمیٹی کے ٹکٹ پر دو مرتبہ بلدیہ کے انتخابات میں کامیابی

حاصل کی اور بلدیہ کے اجلاسوں میں بہت ہی فعال رول ادا کیا ۶

جواد رضوی

سابق لائبریرین سالار جنگ لائبریری

۱۵) جہاں دار افسرؔ سے میری ملاقات کب ہوئی یہ تو کہنا مشکل ہے لیکن ان کی شخصیت کچھ ایسی ہے کہ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ان کی اور ہماری ملاقات پیدائش سے ہے۔ جہاں دار افسرؔ تو ایک صاحبزادہ خاندان سے ہیں۔ لیکن زندگی بڑی عسرت میں گذاری۔ جب حیدرآباد کا ہر مسلمان بادشاہ کا نعرہ لگاتا تو ہم نے جہاں دار افسرؔ کو دیکھ کر کہا تھا کہ بادشاہ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جہاں دار افسرؔ صفیؔ کے بلند پایہ شاگردوں میں ہے ان کی شاعری میں جو سماجی شعور جھلکتا ہے وہ ان کو ترقی پسندوں کی صفوں میں ممتاز رکھتا ہے۔ اب یہی دیکھئے چار مینار کے چاروں مینار کو دیکھ کر جہاں دار افسرؔ کی ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی کی یاد آتی ہے کہ یہ ملک چار مینار ہے اور انھوں نے ہی اس ملک کو خوب صورتی بخشی جہاں دار افسرؔ کسی نام ونمود کی خواہش نہیں رکھتے بہت ہی منکسر المزاج اور متاثر کن شخصیت کے مالک ہیں ۷

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

سابق ایم. پی: نائب صدر ترقی اُردو بیورو نئی دہلی

و نائب صدر کل ہند انجمن ترقی اُردو

۱۶) جہاں دار سے ملاقات کی تاریخ تو یاد نہیں لیکن واقفیت بہت پرانی ہے۔ ہم بھی ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ اور وہ بھی۔ اس لئے جان پہچان ہونا فطری تھا۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے ترقی پسندانہ تحریکات سے ایک بار وابستگی کی تو ہر طرح اور ہر قدم پر وفاداری نبھائی حالانکہ کئی لوگوں نے جنھوں نے اس زمانے کا مقبول رنگ سمجھکر اپنایا تھا حالات کے بدلتے ہی دوسرے راستوں پر چل پڑے بقول مرزا غالبؔ

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

آج بھی وہ اپنے قلم اور عمل سے ہر اُس تحریک کے ساتھ ہیں ۔ جو عوام کو بھلائی کی طرف لے جاتی ہے۔ صحافی ہونے کے ناطے اُنھوں نے خدمت خلق کا کام مسلسل کیا ہے اور آج بھی کرر ہے ہیں۔ جہاں دار افسؔر کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے کچھ ایسی باتوں کا سمجھنا بھی ضروری ہے جو ایک شخص کو شخصیت بناتی ہے ۔ صاحبزادہ میر جہاں دار علی خاں افسؔر نے اور ان سے ذرا پہلے صاحبزادہ میر محمد علی میکشؔ نے ایک آسودہ ماحول اور خوش حال زندگی میں پروان چڑھنے کے باوجود اپنے حساس دل کو زمانہ شناس نظر کی وجہ سے اپنی ذات سے باہر بھی زندگی کو دیکھا پرکھا اور اسے سنوارنے کی کوشش کی اور یہ راستہ اپنانا ان کیلئے مجبوری نہیں آزادانہ فیصلہ تھا۔ اور اُنھوں نے بڑی قیمت ادا کی صاحبزادہ ہونے کے ناطے انھوں نے حیدرآباد کے درخشاں دور میں آنکھ کھولی تو بہت سی عمدہ چیزیں انھیں وراثت میں ملی یعنی تہذیب، شائستگی وضع داری، شرافت، علم دوستی، دوست داری، یہ ایسی روایات ہیں جو آج بھی جہاں دار افسؔر کو اپنے ماحول میں ممتاز بناتی ہیں۔ ان کے حافظہ میں اس دور کی بہت سے خوشگوار یادیں آج بھی محفوظ ہیں ۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق نے انھیں عوام دوست رویہ اپنایا اور اپنی انفرادی زندگی کی قید و بند سے نکل کر عوامی احساسات اور معمولات کا ترجمان بنایا۔ وہ صرف قلم یا زبان سے خدمت نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ عملی طور پر ہر جدو جہد میں حصہ لیا اس دوران کیا کھویا کیا پایا اس کا اندازہ کوئی اور نہیں لگا سکتا کیونکہ حرف شکایت کبھی ان کی زبان پر نہیں آیا ۔ ہر حال میں وہ مست ہیں۔ ان کی طبیعت میں ایک خاص قسم کا توازن موجود ہے۔ وہ کبھی اپنے آپ سے باہر ہوتے نہیں دیکھائی دیئے ان کی کشادہ دلی اور روشن خیالی نے ہر حالت میں پرسکون رہنا سکھادیا۔ آج وہ قلم کے دھنی ہیں۔ زندگی کے سایہ ڈھل رہے ہیں۔ مگر ان کے تازہ دم ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑا وہ اب بھی زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں سیاست کی طرح صحافت بھی اب آلودگی سے ملوث ہونے لگی ہے۔ لیکن جہاں دار افسؔر کا دامن بے داغ ہے۔ وہ آج بھی اپنی انسان دوستی و حق گوئی کے ناطے معتبر آواز مانے جاتے ہیں۔ ان کی نگارشات جو ان کی یادداشتوں پر مشتمل ہے ''حیدرآباد دیدہ و شنیدہ مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا'' خاصہ کی چیز ہے جب دور ختم ہو جاتا ہے

تو اس کی بوسیدہ و بے کار نقصان رساں اور لایعنے خصوصیات پر خطِ تنسیخ پھیرنا پڑتا ہے۔ مگر ہر ڈھائے ہوئے کھنڈیروں کے ملبے میں کچھ اعلیٰ و پسندیدہ اصول و عقائد کی تہذیب و شرافت کی روایات بھی دفن ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ہمارے ایسے ادیب و شاعر جو دور رس فکر اور دور اندیش نگاہ کے حامل ہوتے ہیں انھیں اپنی یاد داشتوں میں محفوظ کر لیتے ہیں ۔ اسی کو شاید ہر دور کے خاتمہ پر nostolgis لٹریچر کی تخلیق کا جواز سمجھا جاتا ہے۔ جہاں دار افسرؔ اس دور کے اوپر سے لے کر اندرونی اور زیریں سطح زندگی کی ہر پرت کی کیفیت و حالت سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے اس سلسلہ کا ان سے بہتر راوی حیدرآباد کے لئے اور کون ہوسکتا ہے۔ ان سے التماس ہے کہ وہ اپنے ذہن کے ہر گوشے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی یادداشتوں کو ملفوظ کر دیں۔ یہ ان کا آنے والی نسلوں کے لئے سب سے بڑا اور گراں قدر تحفہ ہوگا [۸]

ڈاکٹر زینت ساجدہ

سابق صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی

۱۷) جہاں دار افسرؔ آصف جاہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور آصف جاہی خاندان میں بھی ان کا سلسلہ مبارز الدولہ سے ملتا ہے۔ مبارز الدولہ ایک باغی شہزادے تھے انھوں نے اپنے خاندان کے حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی یہی جراثیم جہاں دار میں منتقل ہوئے۔ آصف جاہی خاندان کا یہ سپوت برطانیہ کے یار وفادار میر عثمان علی خاں آصف سابع کے خلاف باغیانہ رویہ اختیار کیا برطانوی سامراج کے خاتمہ کی جدوجہد اور جاگیرداری نظام کے خاتمہ کے خلاف جو لڑائی شروع کی تھی۔ اس لڑائی کے میدان میں آصف جاہی خاندان کا یہ سپوت ''سرفروشی کی تمنا دل میں لئے ہوئے'' اس میدان عمل میں اتر پڑا باغیانہ جدوجہد کے لئے ان میں ہمت اور جرأت اس وقت پیدا ہوئی جب وہ ورثے میں ملنے والی تمام جاگیر دارانہ خصوصیات اپنی ذات سے نکال باہر کیا اور محنت کش طبقہ کے بے لوث اور بے غرض صفات کو اپنی فطرت بنالیا تب کہیں وہ صاحبزادہ میر جہاں دار علی خاں افسرؔ کی بجائے ''کامریڈ افسرؔ'' بن گئے۔ ان کی ان ہی صفات نے انھیں عوام میں مقبولیت عطا کی بے لوث

رہنمائی کے سبب موسپل کارپوریشن کے دو بار ممبر بھی چنے گئے انھیں نے جو بھی کام کیا پوری ایمان داری اور خلوص سے کیا۔ صحافت کے پیشے میں قدم رکھا تو یہاں بھی پوری ایمان داری اور صحافتی دیانتداری کے ساتھ اس پیشہ کو نبھایا۔ ایک اچھے رپورٹر کی حیثیت سے صحافتی حلقوں میں جانے پہچانے گئے۔ خاص طور پر ہندو مسلم فسادات کے وقت انھیں نے اخبار کے لئے جو رپورٹنگ کی اس میں وہ غیر جانبدار رہے اور حقیقی واقعات پر مبنی رپورٹنگ کی وہ فرقہ واریت کی بڑی احتیاط کے ساتھ مخالفت کرتے تھے۔ اور اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ایک فرقہ پرستی کے خلاف اسطرح آواز نہ اُٹھائی جائے کہ اس کے جواب میں دوسرا فرقہ پرستی کی آواز اُٹھائے۔ ۹

مصطفیٰ علی بیگ

منیجر روزنامہ سیاست

۱۸) افسر صاحب کی پوری زندگی عمل اور جدوجہد سے عبارت ہے۔ اگر چہ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے لیکن ان کا حساس ضمیر انھیں ایک اور ہی راہ پر لے چلا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی سے اس وقت وابستہ ہوئے جب ان کی عمر صرف سترہ سال کی تھی اور اب تک ''وفاداری بہ شرطِ استواری'' کا ایک چلتا پھرتا نمونہ بنے ہوئے ہیں یہی نہیں بلکہ ملک کی جتنی ترقی پسند اور یساری تحریکیں ہیں ان سے انھوں نے کوئی نہ کوئی رشتہ قائم کر رکھا ہے۔ اور محکوموں' مجبوریوں اور لاچاروں سے متعلق مسائل و مصائب کے ارتفاع کے لئے جان کی بازی لگانے سے بھی انھوں نے دریغ نہیں کیا بھوک ہڑتالیں کیں پولیس کے ڈنڈے کھائے' جیل گئے مگر اپنے مقصد سے کبھی منہ نہیں موڑا نہ دل برداشتہ ہوئے۔ آج بھی ان میں نوجوانوں کا سا جذبۂ عمل ہے وہ کام ہی کو اس کا انعام سمجھتے ہیں۔ اگر چہ کہ انھیں بہت سے ایوارڈز اور انعامات ملے مگر اس سے شاید ان ایوارڈز ہی کے وقار میں اضافہ ہوا۔ ان کے اعتراف خدمات کا ایک جشن بھی منایا گیا مگر وہ مطمئن ہو کر بیٹھے نہیں رہے پرانہ شہر جو دراصل مستضعفین کی بستی ہے اس کی خوش حالی اور ترقی کے لئے ان کی ساری کاوشیں وقف رہیں۔ وہ بلدیہ کے دو مرتبہ کونسلر بھی منتخب ہوئے۔ اس زمانہ میں انھیں خدمت کے خلق کے بڑے مواقع

حاصل ہوئے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ خود انھوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مواقع نکالے۔ ان کے حلقہ کے بیشتر فلاحی کام ان ہی کی کدو کاوش کا ثمر ہے۔ ان کے کردار کے کھرے پن کی سب سے بڑی کسوٹی یہ ہے کہ وہ آج بھی قدیم شہر کے ایک افتادہ کرائے کے مکان میں ایک صاحبزادہ کے ساتھ مقیم ہیں ۔مسکراہٹ ان کے چہرہ کے نقوش کا جزولاینفک ہیں درآں حال یہ کہ ان پر بڑی بڑی شخصی قیامتیں بھی ٹوٹ چکی ہیں۔ رفیق حیات کا ساتھ چھوٹا۔ ایک صاحبزادے نے عین عالم شباب میں داعی اجل کو لبیک کہا مگر ان کے لبوں سے کچھ نکلا تو بس اتنا کہ

پروردگار یہ تو رسولوں کی بات ہے!

ابھی انھوں نے ہوش ہی سنبھالا تھا کہ ان کے پرکھوں کی وسیع وعریض جائیداد اور کوٹھی نیلام ہوگئی۔ تب سے اب تک ان کے شب و روز نے کوئی پلٹا نہیں کھایا۔ جہاں دار افسر جلال بادشاہی عروج کے دوران میں بھی متکبرین کی روش کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور عتاب شاہی کے شکار ہوئے۔ جو فیصلہ انھوں نے اس وقت لیا تھا اب تک اس پر ثابت قدم ہیں۔ اس کا انھیں افسوس ہے نہ ملال۔ صبر و استقامت ان کے کردار کے نہایت مضبوط ستون ہیں جنھوں نے بدترین زلزلوں میں بھی اس عمارت کی ایک اینٹ کو بھی ہلنے نہیں دیا۔ اس علاقہ میں سیاست نے مذہب کا استحصال کر کے بھی بڑے بڑے گُل کھلائے مگر وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہے۔ یہ بھی نہیں کہ وہ کوئی مذہب بیزار شخص ہیں۔ ان کو شعائر مذہبی کا پورا پاس ولحاظ ہے۔ حج سے بھی وہ مشرف ہو چکے ہیں لیکن وہ اس ''معرکے'' کے ''انجام'' سے بھی واقف ہیں جس میں ''ملاّ غازی'' بن کر انسانیت کا دھڑن تختہ کر دیتا ہے۔ اس ساری عمل جہد آزما زندگی گذارنے کے باوجود انھوں نے اپنے آپ سے مکالمہ بھی جاری رکھا جس کا حاصل ہے۔ ان کے شعری مجموعہ ''کھلی آنکھوں کا خواب'' وہ خواب زندگی بھر دیکھتے رہے مگر جاگتی آنکھوں سے۔ ان کی شاعری کا تخیل کی چڑی ماری اور ردیف کو چمکانے اور قافیہ کو برمانے سے دور کا بھی علاقہ نہیں ان کا فلسفہ حیات ان کی شاعری میں خون حیات بنکر دوڑ رہا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی جہد و عمل سے بھرپور زندگی گذارنے کے باوجود انھوں نے کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے شعر و سخن کا

ایک وقیع سرمایہ بھی ہماری حوالے کیا ہے ۱۰

مضطؔر مجاز

۱۹) جہاں دار افسؔر نہ صرف میرے استاد بھائی ہیں بلکہ میری اوائل عمری کے ایک شاعر دوست بھی ہیں حضرت صفؔی اورنگ آبادی کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کا ہم دونوں کوشرف حاصل رہا ہے۔ جہاں دار افسؔر اپنا ایک منفرد مزاج رکھتے ہیں انھوں نے جہاں حضرت صفؔی سے علم عروض سیکھا وہیں انھوں نے اپنی شاعری کو ہمیشہ حیات آمیز اور حیات آموز بنانے کی کوشش کی وہ صرف مشاعرے ہی کے شاعر نہیں رہے بلکہ اپنی عملی زندگی کو بھی شعری روپ دیا۔ ہمیشہ ترقی پسند ادبی تحریک کے طرفدار رہے اسی لئے ان کی شاعری میں جہاں عام لوگوں کی زندگی کا کرب ملتا ہے ۔ وہیں عام لوگوں کے بہتر مستقبل کے خواب بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ ان کے شعری مجموعہ کا نام ''کھلی آنکھوں کے خواب'' ہے انھوں نے ہمیشہ اپنی ذہنی کھڑکیاں کھلی رکھیں تاکہ نئی زندگی کی نئی ہوا اور نئی روشنی سے وہ دور نہ رہیں۔ جہاں دار افسؔر میرے محترم اور محتشم دوست ہیں وہ حکمرانوں کے ہمیشہ معتوب رہے مگر انھیں عام آدمی کے محبوب ہونے کا اعزاز وافتخار حاصل رہا۔ پولیس ایکشن سے پہلے وہ خانوادہ شاہی کے رکن کی حیثیت سے سب کچھ تھے مگر حیرت اس بات پر ہے کہ وہ آج بھی عام لوگوں کے پسندیدہ شاعر، صحافی اور عوامی خدمت گذار ہونے کے باوجود اپنی عملی زندگی میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ ''مگر انھیں اپنے غمِ ذات سے زیادہ غمِ کائنات کی فکر لگی رہتی ہے'' ۱۱

خواجہ شوؔق

۲۰) جہاں دار افسؔر کو جاننا اور پہچاننا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ وہ بہت کم لوگوں کے سامنے کھلتے اور اپنے بارے میں معلومات دیتے ہیں۔ میں ان کی تہذیب وشائستگی اور شعری وصحافتی صلاحیتوں کا ہمیشہ مداح رہا ہوں۔ مجھ پتا نہیں تھا کہ وہ خاندان آصف جاہی کہ رکن راکین ہیں۔ میں انھیں بحیثیت جرنلسٹ کے دیکھا اور پرکھا ہے ان کی رپورٹنگ کا انداز دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ تقریر کرنے والے اور انٹرویو لینے والے کہ جذبات واحساسات کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر

ہمیشہ اعلیٰ و مبارک انسانی اقدار رہتے ہیں ان ہی نظریات وخیالات نے انھیں ایک معتبر شاعر' صحافی اور عوامی خدمت گذار بنا دیا ہے۔ وہ شہر حیدر آباد میں دو میقات تک مجلس بلدیہ کے رکن رہے اور ان کے کارنامے آج بھی قدر و منزلت کے ساتھ مغلپورہ اور پرانے شہر میں یاد کیے جاتے ہیں۔ [۲۰]

**آصف پاشا**

**سابق وزیر قانون و سابق صدر نشین آندھرا پردیش اقلیتی کمیشن**

**و سابق صدر نشین اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش**

۲۱) ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن کے بعد حیدر آباد میں بھی ایک مایوسی کا ماحول تھا۔ اس وقت اقلیتی طبقہ کیلئے کوئی ہمدرد و رہنمائی کیلئے آگے نہیں آئے اور ایسے وقت اُردو اخبارت ہی اقلیتی طبقہ کیلئے رہنمائی کرتے۔ پولیس ایکشن کے کچھ عرصہ بعد اُردو اخبارات بھی کم بیش بند ہو گئے۔ انقلاب پیام۔ ہمارا اقدام اور کچھ ہفتہ وار اخبارات جاری ہوئے۔ اقلیتی طبقہ کی رہنمائی اور صحافت کے ذریعہ مسائل کا پیش کرنا بڑا مشکل تھا۔ لیکن اِن تمام حالات کے باجود کامریڈ جہاں دار افسر نے ''اگر میں وزیر آعظم ہوتا'' کے عنوان سے عوام کے مسائل پر لکھتے اور اقلیتی طبقہ کی رہنمائی کرتے۔ پولیس ایکشن کے تین سال بعد ممتاز کمیونسٹ قائد کامریڈ مخدوم محی الدین گرفتار کئے گئے۔ ۱۹۵۲ء کے جنرل الیکشن سے پہلے سروجنی نائیڈو اور جہاں دار افسر دیگر سیاسی اور سماجی قائدین نے عوامی جمہوری محاذ کی بنیاد رکھی اور مخدوم محی الدین اور دیگر قائدین کی رہائی کیلئے کامریڈ جہاں دار افسر کی رہنمائی میں تحریک چلائی گئی۔ اس تحریک میں اقلیتی طبقہ کے نوجوان زیادہ تعداد میں آئے اور مخدوم محی الدین کی رہائی عمل میں آئی۔ پرانے شہر میں جہاں دار فسر کے ساتھ نوجوانوں کا ایک کاروان بنا انکا ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک اور رویہ ہی اقلیتی فرقہ کے نوجوانوں کو حوصلہ دیا۔ ۱۹۵۷ء میں کمیونسٹ پارٹی اور شہر کے کئی تنظیم وعوامی قائدین بھائی رام مورتی، نائیڈو مگن چند ویدی، کاشی رام وغیرہ کے ساتھ متحدہ شہری کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ متحدہ شہری کمیٹی کے ٹکٹ پر کامریڈ جہاں دار افسر کو مغلپورہ بلدی حلقہ سے ٹکٹ دیا گیا۔ جہاں دار افسر کی کامیابی کیلئے پارٹی ورکر اور نوجوانوں میں اک جوش و امنگ تھا۔ پارٹی ورکر اور نوجوان رات دن محنت کرتے۔ ہر ورکر جہاں دار افسر کی کامیابی کو اپنی کامیابی تصور کرتا

۔انگریزی اخبارات پر پوسٹر چھاپے گئے ہر نوجوان صبح پر بھات پھیری ۵ بجے سے شام جلسہ عام رات ۱۲ بجے تک کام کرتے صرف ایک کامیابی کی لگن تھی ۔ جہاں دار افسر کامیابی کے بعد اپنے ساتھیوں اور نوجوانوں سے بہتر سلوک اور محبت سے پیش آتے تھے۔ جہاں دار افسر کا الیکشن چند سو روپیوں میں لڑا گیا۔ یہ الیکشن جہاں دار افسر سے خلوص اور اقلیتی طبقہ کے نوجوانوں کا قومی یکجہتی کے دھارے میں شامل ہونے کا حوصلہ ملا۔ جہاں دار افسر ایک صاحبزادہ طبقہ سے تعلق رکھنے کے باوجود انکو محنت کش غریب کش غریب عوام میں اتنے مقبول ہیں ۔کہ ہر کوئی اپنا ہمدرد اور اچھا نمائندہ مانتے تھے۔ جہاں دار افسر رکن بلدیہ منتخب ہونے کے بعد بھی رات دن عوام سے رابطہ رکھنا اور بھر پور نمائندگی کرنا اپنا فرض سمجھا اسکے باوجود انکو لوگ اپنے قریب ترین دیکھنا پسند کرتے تھے۔ایک لیٹر سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں ۔اس وقت میں کمیونسٹ پارٹی مغلپورہ یونٹ کا سکریٹری تھا لیٹر میں لکھا گیا کہ جہاں دار افسر صاحب رکن بلدیہ منتخب ہونے سے پہلے سلام کرتے تھے۔اب وہ سلام نہیں کرتے پارٹی آفس میں یہ آنے پر رکن بلدیہ سے کہا گیا کہ آپ سلام کیا کیجئے ۔انھوں نے بغیر احتراز کے تسلیم کیا کہ سلام کرینگے کچھ ہی دن بعد دوسرا لیٹر وصول ہوا کہ اب صرف سلام کرتے ہیں کیفیت نہیں دریافت کرتے کیفیت بھی دریافت کرنے کو کہا گیا۔اس لیٹر سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عوام اس رکن بلدیہ سے والہانہ محبت کرتے تھے۔اک مرتبہ ایک صاحب غرض جہاں دار افسر کے مکان واقع پیلی پھاٹک پنج محلہ تشریف لائے اور کہا کہ آپ کل بلدیہ آفس آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آپ تشریف نہیں لائے آج آپ میرے ہی ساتھ دفتر چلیئے ۔لیکن جہاں دار افسر اُن صاحب سے معافی کے ساتھ دو روز بعد چلنے کیلیئے اصرار کیا۔وہ صاحب موصوف خفگی کا اظہار کرنے لگے میں اس وقت موجود تھا۔میں نے وہ صاحب موصوف سے کہا کوئی وجہ دریافت کئے بغیر آپ خفگی کا اظہار کر رہے ہیں اگر حسب وعدہ کل نہیں آئے اور آج نہیں چل رہے ہیں۔تو کچھ وجہ ہوگی کل جہاں دار افسر کی والدہ محترمہ کی حالت تشوشناک تھی آج اُن کا انتقال ہوگیا اس وقت میت گھر پر ہے اس سبب وہ آپ کے ساتھ چل نہیں سکتے موصوف شرمندہ ہوئے اور معافی مانگ کر رخصت ہوئے۔یہ بات خود بہ حیثیت رکن بلدیہ وہ نہ کہہ سکے کہ وہ کبھی بھی اپنی طرف سے اپنی تکلیف کا اظہار نہ کرتے ۔اہل غرض سے خندہ

پیشانی سے پیش آئے۔ جہاں دار افسر دوسری معیاد کے لئے دوبارہ منتخب ہوئے۔ عوام کی جانب سے ایک جلوس چار مینار تا مغلپورہ نکالا گیا۔ جس کی رہنمائی حیدرآباد کے مشہور پہلوان حاجی پہلوان اور دیگر حضرات کر رہے تھے۔ مغلپورہ میں جلسہ عام منعقد ہوا۔ کثرت سے جہاں دار افسر کی گل پوشی کی گئی بعد جلسہ عام تمام ورکر شاہ علی بنڈہ آفس چلے گئے۔ جہاں دار افسر مکان جانے کیلئے روانہ ہوئے ۔دوسرے دن صبح ٦ بجے جہاں دار افسر کے فرزند تجمل اظہر آفس آئے وہ اپنے والد کو دریافت کر رہے تھے۔ کیوں کہ وہ اپنے مکان نہیں گئے تجمل اظہر نے کہا ہم لوگ والد صاحب کا انتظار کر رہے تھے ۔رات مکان نہیں آئے مکان میں ہم لوگوں کے لئے کوئی کھانے کا انتظام نہیں وہ کچھ لائے تو ہم کھائیں گے ہم انتظار کر رہے ہیں۔ میں فوری عثمان شیرینی سے کھارے وغیرہ کا انتظام کیا اور تلاش میں نکل گیا۔ جہاں دار افسر کا مریڈ مہدی عابدی کے مکان ایرانی گلی میں موجود تھے۔ میں نے تجمل اظہر کے آنے اور تمام حالات کا ذکر کیا جہاں دار افسر تجمل اظہر کے آنے پر چونک گئے اور کہنے لگے'' عزیز طاہر عوام میری کامیابی کا جشن منا رہے تھے اور جہاں دار افسر زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے ۔اس وقت میرے اہل وعیال بھوکے تھے۔'' اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۴ سال تک رکن بلدیہ رہنے کے بعد انکے گھر ایک وقت کی روٹی بھی نہیں۔ کیوں کہ کبھی وہ کسی سے کوئی مطالبہ کیا نہ کسی سے کوئی نذرانہ لیا کبھی روڈ یا طہارت خانوں کی تعمیر کے وقت معائنہ کو جاتے تو پارٹی سکریٹری اور مشاورتی بورڈ کے اراکین ساتھ رہتے مشاورتی بورڈ خود جہاں دار افسر نے ہر بستی کے ذی اثر حضرات سے ملکر تشکیل دیا تھا۔ تعمیری کام کا سالانہ دیباچہ بلدیہ کی جانب سے اُردو میں پرنٹ ہو کر تقسیم کیا جاتا ۔رکن بلدیہ کو سالانہ رقم جو بجٹ کی شکل میں منظور ہوتی مشاورتی بورڈ کے اراکین کے اجلاس میں دیا جاتا تھا۔ جہاں دار افسر کا آبائی مکان پنچ محلہ پیلی پھاٹک فروخت ہوا اس وقت میں ریاست نگر درگاہ برہنہ شاہ منتقل ہو گیا تھا۔ ریاست نگر نواب میر ریاست علی خاں کی جائیداد تھی جو جہاں دار افسر کے سسرالی رشتہ دار تھے۔ دو روپے گز زمین فروخت کی جا رہی تھی میں نے جہاں دار افسر سے کہا کہ وہ کچھ زمین صاحبزادہ نواب میر ریاست علی خان سے خرید لیں ۔لیکن افسر صاحب نے انکار کیا اور کہا کہ میں زمین خرید کر مکان نہیں بنا سکتا ان کے سارے حالات کو پیش نظر رکھکر فیصلہ کرنا ہوگا ایک رکن

بلدیہ دو معیاد کے لئے منتخب ہوتا ہے۔ اور ایک چھوٹا سا ذاتی مکان بھی نہیں رکھتا آج تک بھی وہ کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں وہ ہمیشہ ہر مشکل وقت میں مسکراتے ملے وہ نوجوان فرزند کی اچانک موت دو جواں بھائیوں کا صدمہ اور آخر شریک حیات کی جدائی کو بھی برداشت کئے ہیں۔ آج وہ جہاں دار افسر جو پچاس سال پہلے ملے تھے وہی سلوک وہی محبت اور غریب محنت کش عوام کی خدمت کا جذبہ لئے ہوئے ہیں ۱۳؎

ہم نے ہنس ہنس کے تیری بزم میں اے پیکر ناز
کتنے آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم (مخدوم)

عزیز طاہر
سکریٹری کمیونسٹ پارٹی بنڈلہ گوڑہ منڈل و رکن حیدرآباد سٹی کونسل

## حواشی :

۱؎ تا ۹ آرا محمد علی حسینی ایس اے روف: جہاں دار افسر شخص اور عکس صفحہ (۱۴) اور صفحہ (۱)

۲؎ جسٹس سردار علی خاں جہاں دار حیات اور کائنات کا شاعر (ص ۵ اور ۶)

۳؎ مجتبیٰ حسین جشن ایک شریف آدمی کا (ص ۹ تا ۱۰)

۴؎ مہدی عابدی جہاں دار افسر میرا ساتھی میرا دوست (ص ۲۶ اور ۲۸)

۵؎ محمد منظور احمد نے اپنے خیالات کا اظہار مقالہ نگار سے ۱۲/ اگست ۱۹۹۹ء کو کیا۔

۶؎ جناب جواد رضوی نے اپنے ان خیالات کا اظہار مقالہ نگار سے ۱۳/ اگست ۱۹۹۹ء کو کیا۔

۷؎ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے مقالہ نگار سے اپنے ان خیالات کا اظہار ۲۱/ اگست ۱۹۹۹ء کی شام ۶/ بجے کیا

۸؎ ڈاکٹر زینت ساجدہ نے اپنے یہ خیالات کا اظہار ۱۸/ اگست ۱۹۹۹ء دوپہر کو مقالہ نگار سے کیا۔

۹؎ مصطفیٰ علی بیگ جو روزنامہ سیاست سے وابستہ ہیں اپنے ان خیالات کا اظہار ۱۳/ اگست ۱۹۹۹ء کو مقالہ نگار سے کیا۔

۱۰؎ مضطر مجاز روزنامہ منصف ۱۳/ ستمبر ۱۹۹۸ء

۱۱؎ ممتاز استاد سخن حضرت خواجہ شوق نے مندرجہ بالا کلمات مقالہ نگار سے ایک ملاقات میں ۱۶/ نومبر ۱۹۹۹ء کو ۱۱ بجکر ۳۰ منٹ پر کہے ہیں۔

۱۲؎ محترم جناب آصف پاشا نے ۱۶/ اکٹوبر ۱۹۹۹ء کو ۱۲ بجکر ۵۵ منٹ کو اپنے انٹرویو میں مقالہ نگار سے ان خیالات کا اظہار کیا۔

# جہاں دار افسرؔ کی ادبی و صحافتی خدمات کا تنقیدی جائزہ

جہاں دار افسرؔ نے ایک جاگیردارانہ گھرانے میں جنم لیا آصفی خاندان سے قریبی تعلق کے باوجود انھوں نے ہمیشہ اُس گروہ انسانی کا ساتھ دیا جو ظلم کی بہ جائے انصاف کا قائل ہے۔اور جو انسانی بھائی چارگی میں بھروسہ رکھتا ہے۔حریت پسندی، جمہوریت دوستی، قومی یکجہتی اور سامراج دشمنی جس کا بنیادی مزاج و کردار ہے۔ جہاں دار افسرؔ نے منفی رجحانات سے انحراف کرتے ہوئے مثبت اقدار کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔وہ دھن کے پکے ہیں اور اپنی سیاسی سماجی اور ادبی اصولوں کو لباس کی طرح نہیں بدلا۔یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے ترقی پسند اندانہ تحریکات سے ایک بار وابستگی اختیار کی تو ہر طرح اور ہر قدم پر وفاداری نبھائی حالانکہ کئی لوگوں نے جنھوں نے اس زمانے کا اسے ایک مقبول رنگ سمجھ کر اپنایا تھا حالات کے بدلتے ہی دوسرے راستوں پر چل پڑے۔آج بھی جہاں دار افسرؔ اپنے قلم اور عمل سے ہر اس تحریک کے ساتھ ہیں جو عوام کو بھلائی کی طرف لیجاتی ہے۔صحافی ہونے کے ناطے انھوں نے خدمت خلق کا کام مسلسل کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔

جہاں دار افسرؔ نے ایک آسودہ حال ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود اپنے حساس دل کو زمانہ شناس نظر کی وجہ سے اپنی ذات سے باہر کی بھی زندگی کو دیکھا پرکھا اور اسے سنوارنے کی کوشش کی اور یہ راستہ انھوں نے مجبوری کی حالت میں نہیں بلکہ اپنی مرضی سے قبول کیا۔اس کے لئے انھوں نے بڑی قیمت ادا کی ہے۔شاہی خاندان کے فرد اور صاحبزادہ ہونے کے ناطے انھوں نے حیدرآباد کے درخشاں دور میں آنکھ کھولی تو بہت سی عمدہ چیزیں انھیں ورثہ میں ملیں یعنی تہذیب، شائستگی، وضعداری، شرافت، علم دوستی، دوستداری یہ ایسی روایات ہیں جو آج بھی جہاں دار افسرؔ کو اپنے ماحول میں ممتاز بناتی ہیں۔ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں عوام دوست بنایا۔وہ صرف قلم یا زبان سے خدمت خلق نہیں کرتے بلکہ عملی طور پر ہر جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اس دوران انھوں نے کیا کھویا کیا پایا۔۔۔۔۔؟ اس کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا کیونکہ

حرف شکایت کبھی ان کے زبان پر نہیں آیا۔ وہ ہر حال میں مست ہیں. ان کی طبیعت میں ایک خاص قسم کا توازن ہے۔ ان کی کشادہ دلی اور روشن خیالی نے ہر حالت میں انھیں پر سکون رہنا سکھا دیا ہے۔

سوال نمبر۱: ایک مسلمان، کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہونے پر اس کے ایمان اور عقیدہ کے بارے میں بڑا شک وشبہ ہونے لگتا ہے یہی جناب صاحبزادہ جہاں دار افسر کے بارے میں تھا جو ایک راسخ عقیدہ مسلمان بھی ہیں اور کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن بھی۔ جب میں ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا :

جواب: ''میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ مسلمان ہونے اور کمیونسٹ وابستگی میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ مجھے برسا برس سے کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے مگر کسی نے مذہب کے بارے میں یا میرے ذاتی اعتقاد کے تعلق سے کسی نے کبھی کوئی انگشت نمائی نہیں کی۔ کمیونسٹ پارٹی کا کوئی مذہب نہیں ہے یہ ایک سیاسی، سماجی تنظیم ہے۔ اس تنظیم میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ، پارسی سب ہی شامل ہیں۔ ان لوگوں کے مابین مذہبی اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ پارٹی میں ایک دوسرے کے مذہبی اعتقاد اور احترام کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اپنی نجی زندگی میں اللہ پاک سے اٹوٹ وابستگی اور رسول مقبول سلم کا بندہ بے دام ہوں یوں بھی اسلامی اصول بنیادی طور پر یہی ہیں کہ بے کسوں، بے نواوں کی مدد کی جائے۔ یتیموں اور بیواوں سے رحم دلانہ سلوک کیا جائے۔ اگر ہم پارٹی میں رہ کر اسی پیام کو کو وسیع تر انداز میں پیش کریں تو اس میں تضاد کی کیا بات ہے؟ میرا ذاتی اعتقاد یہ ہے کہ دنیا کے سب سے عظیم اور پہلے انقلابی حضرت محمد ﷺ نے نہ صرف توحید کا ڈنکا بجوایا بلکہ حقوق اللہ پر حقوق العباد کی ترجیح کیلئے حکم الٰہی کی تلقین کی۔ اس طرح بحیثیت مسلمان میرے اندر ایک سچا اور اچھا انقلابی اور صالح معاشرہ کا داعی موجود ہے۔ بڑی غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم مذہب اور موجودہ سیاست میں تفریق نہیں کرتے۔ اعلیٰ مذہبی اقدار کو دنیاداری اور دنیوی مقاصد کی سطح پر رکھ کر دیکھتے ہیں۔ مذہب وہ بھی اسلامی مذہب دائمی اور ازلی اقدار رکھتا ہے۔ جب کہ آج کے سیاسی اصول ناپائیدار ہوتے ہیں اس لئے مذہب اور سیاست

کو ایک ساتھ دیکھنا غلط ہے۔ مذہب، اللہ اور بندے کا دائمی رشتہ ہے جب کہ سیاست وہ بھی جس سیاست میں آج ہم سانس لیتے ہیں وہ تو انتہائی گندہ اور آلودہ ہو چکی ہے، جہاں تک میرا مطالعہ اور مشاہدہ ہے پارٹی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو دہریت کا اعلان ڈنکے کی چوٹ پر کرتے ہیں۔ مگر ہندوستان میں ایسے کمیونسٹ بہت کم ہوں گے اور اسی طرح ایسے مسلمان بھی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے اور ہیں جو راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ جیسے مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد سبحانی اور مولانا اسحاق سنبھلی وغیرہ جو پابند صوم وصلوٰۃ رہے ہیں۔ چنانچہ مجھے بھی بے شمار کمیونسٹوں کی طرح حج بیت اللہ اور زیارتِ مدینہ منورہ کی سعادت حاصل ہوئی۔

سوال نمبر۲: صاحبزادہ جہاں دار افسر نے حیدر آباد کے شاہی گھرانے میں آنکھ کھولی، شاندار محلات میں ان کی زندگی گزری، عیش وعشرت کی زندگی کے باوجود وہ غریب اور محنت کشوں کے کیوں ہمدرد بنے اور آصف جاہی حکمراں نواب میر عثمان علی خاں، آصف سابع کی کیوں مخالفت مول لی۔ جب میں ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا :

جواب: ''جہاں تک جاگیر شاہی سے میرے ٹکر لینے کا سوال ہے اس میں بھی میں کوئی تزاد محسوس نہیں کرتا۔ میں مدرسہ اعزاء، مدرسہ عالیہ اور نظام کالج کا طالب علم رہا ہوں۔ مدرسہ عالیہ میں انگریزی لیڈی ٹیچر تعلیم دیتی تھیں اور پرائمری سے ہائی اسکول تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرے اساتذہ نے مذاہب کا کھلی آنکھ اور کھلے دل کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ مجھ میں بچپن ہی سے یہ احساس بیدار رہا کہ انسانوں میں امیر وغریب کی تفریق بے سود ہے، ہر انسان خواہ اس کا دین، دھرم، ایمان وایقان کچھ بھی ہو وہ اپنے خالق کے پاس صرف نیکی اور بدی کی اساس پر اچھا اور برا ہوگا۔ میں نے محلوں میں غریب ملازمین اور نوکروں کے ساتھ جو برا سلوک دیکھا تو مجھے اس سلوک سے نفرت ہونے لگی اور میں اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ایسی آزاد فضا کا آرزومند بن گیا جہاں اس ظلم و جور کے خلاف مجھے آواز اٹھانے کی آزادی ملے۔ خواہش اور تڑپ کو میں نے صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش کے آگے ظاہر کیا جو میرے رشتوں کے تایا زاد بھائی تھے۔ انہوں نے مدرسہ عالیہ

بورڈنگ ہاؤز ماسٹر، جناب میر حسن ایم۔اے (عثمانیہ) سے ربط بڑھانے کا مشورہ دیا ۔میر صاحب کے پاس جناب مخدوم محی الدین، شہاب الدین، ظفر الحسن، اشفاق حسین، سعادت علی خان اور جامعہ عثمانیہ کے اس دور زریں کے تمام لوگ آتے جاتے تھے۔ مجھے بورڈنگ میں رہنے کے سبب ان حضرات سے علمی ادبی اور سیاسی استفادہ کا قدم بقدم موقع ملتا رہا۔ چنانچہ میر حسن صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ میکش کے بھائی ہیں اور دیگر طلباء سے الگ مزاج رکھنے والا لڑکا ہے تو میر حسن صاحب نے مخدوم محی الدین وغیرہ سے تعارف کروایا اور ان کے فیضان صحبت سے سرمایہ داری اور جاگیر شاہی کے خلاف میری فکری اور نظریاتی لو اور تیز ہوئی اور نظام کالج اسٹوڈنٹس یونین سے بھی میرا رابطہ استوار ہوا۔

راجہ رامیشور راو سابق ایم پی اور نوح عباسی جیسے سوشلسٹ افکار اور اقدار کے حامل افراد سے ہم نشینی اور نظریاتی مباحث کا موقع ملا۔ مگر مجھے پارٹی میں لانے کا سہرا سلیمان اریب کو حاصل رہا جو گذشتہ صدی کے چوتھے دہے میں پارٹی کے کلچرل فرنٹ کے سکریٹری تھے۔ میں نے ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی کی گرفتاری پر نظام کالج میں ہونے والے احتجاجی اور کالی جھنڈیوں کا مظاہر کرنے کا بھی موقع ملا تھا۔ اور آصف سابع کو پہلی یار دو بدو یہ نعرہ سننے کا موقع ملا تھا کہ ''جاگیر شاہی سسٹم ختم کرو''۔ اس سلسلہ میں مجھے اپنے سرپرست خاندان آصف سابع اور بزرگوں کے عتاب کا شکار ہونا پڑا تھا''۔

سوال نمبر۳ : آصف سابع کی مخالفت مول لینے کے بعد صاحبزادہ ٹرسٹ سے الاونس لینا کیوں منظور کیا۔ اس سوال پر انہوں نے بتایا:

جواب : ''جب میری والدہ محترمہ کا انتقال ہوا تو صاحبزادہ ٹرسٹ کی آئندہ اجرائی کو مشکوک سمجھا جانے لگا۔ مگر میں نے دیگر ورثہ کے آئندہ حقوق کے تحفظ کے لئے اور خاندانی شجرہ کے منقطع ہو جانے کے خدشہ کے پیش نظر اپنی والدہ کی الاونس کی اجرائی کو قبول کیا۔ اس طرح میں نے نہ تو کسی سے کوئی مفاہمت کی اور نہ معذرت خواہی۔ جو کچھ ٹرسٹ سے الاونس ملتا ہے وہ کوئی عطیہ شاہی

نہیں بلکہ ہمارا اپنا خاندانی حصہ و حق ہے"۔

سوال ۴ : صاحبزادہ جہاں دار افسر ایک اچھے صحافی، شاعر اور ایک مخلص عوامی خدمات گزار ہونے کے باوجود کیوں امتیازی مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ :

جواب : "مقام و مرتبہ، جاہ و حشم، کرسی نشین یہ سب باتیں ہماری مزاج و کردار سے میل نہیں کھاتیں۔ چنانچہ ہمیشہ ہمیں اپنے اسلاف سے مذہبی اور سیاسی رہنماؤں سے یہی درس ملا کہ "کام کو کام ہی کا انعام سمجھو" اس لئے ہم نے کسی بھی شعبۂ حیات میں سرخروی اور سرفرازی کے لئے کوئی پیروی نہیں کی۔ یوں بھی ہمارا ذہن شروع ہی سے معقولات کا قائل رہا اور ہمیشہ ہی سے منقولات سے بیزارگی رہی۔ ہم نے کسی کو اپنا کوئی "گاڈ فادر" نہیں بنایا، چنانچہ ہم عوام کے درمیان ہی مطمئین اور مسرور رہے۔ ہر شخص پر اپنے اسلاف اور حال ماحول کا گہرا اثر رہتا ہے۔ ہمارا حال و ماحول صوفیانہ رنگ لیا ہوا تھا۔ چنانچہ ہم میں انقلابی انسان دوستی اور احترام آدم کا جذبہ ہمیشہ موجزن رہا اور رہے گا۔

اس طرح یہ سمجھنا کہ ہم اپنا کوئی مقام و مرتبہ بنانے میں ناکام رہے یکسر غلط ہے کیوں کہ یہ ہماری سوچ و فکر کے منافی ہے۔ جہاں تک مقام و مرتبہ کا سوال ہے ہمیں فخر ہے کہ ہمارے عوام نے بلالحاظ مذہب و ملت اور سیاسی وابستگی ہمیں بھرپور عزت بخشی ہے اور ہمیں اپنی دولت محبت سے مالامال کیا ہے۔ اس محبت اور اخلاص کو ہم انمول سمجھتے ہیں اور اسی کو ہم اپنا قیمتی اثاثہ سمجھتے ہیں۔ جہاں تک ایک مخصوص زاویہ ہے کہ وہ انسان کامیاب ہے جو کسی کرسی پر متمکن ہو یا کہیں کوئی مقتدر حیثیت سیاست داں، جس طرح رسوا کن انداز میں سامنے آ رہا ہے وہ خود ایک بڑا عبرتناک سبق ہے۔

سوال نمبر ۵ : جہاں دار افسر نے محلات شاہی میں جنم لیا اور آنکھ کھولی لیکن آج وہ ایک بوسیدہ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ اس طرح کیا انہیں اپنی زندگی پر کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا۔ اس سوال پر انہوں نے بتایا کہ:

جواب: ''یہ زندگی ہم نے مکمل شعور و ادراک کے ساتھ اپنائی ہے۔ کیوں کہ آپ دیکھتے ہیں کہ خود کنگ کوٹھی کا عملاً وجود نہیں رہا تو پھر ہماری ایک آدھ دیوڑھی کا کیا سوال ہے۔ ہمیں اس لئے پچھتاوا نہیں ہوتا کہ جاگیر شاہی کا آشیانہ شاخ نازک پر قائم تھا اور اس کے بکھراؤ کا ہمیں یقین تھا مگر ہمارا یہ بھی احساس ہے کہ جس جاگیر شاہی سسٹم کی شکست و ریخت کے لئے ہم نے کام کیا تھا اس کے ثمرات غریب اور مظلوم طبقات کے حصہ میں نہ آسکے اور آج بھی کمین گاہوں میں عفریت نورِ سحر پینے میں مگن ہیں اس لیے ہم میں یہ احساس شدید ہوتا جارہا ہے کہ جو سیاسی و معاشی آزادی ہم نے حاصل کی ہے اس کی حفاظت کے لئے ہمیں اور ہماری نئی نسل کو کمربستہ رہنا چاہئے کیوں کہ ۔

نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

جہاں دار افسر آج بھی جب کے وہ ۷۵ سال کے ہوچکے ہیں قلم کے دھنی ہیں۔ زندگی کے سایے ڈھل رہے ہیں مگر ان کے تازہ دم ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑا وہ اب بھی زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں سیاست کی طرح صحافت بھی اب آلودگی سے ملوث ہونے لگی ہے لیکن جہاں دار افسر کا دامن بے داغ ہے۔ چنانچہ ۱۴ ستمبر ۱۹۹۴ء کو ان کی ادبی، سماجی، شعری اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں شہر حیدرآباد کی کئی ادبی و تہذیبی تنظیموں جیسے مخدوم سوسائٹی، انجمن ترقی پسند مصنفین، حیدرآباد لٹریری فورم (حلقہ) ادارہ شعر و حکمت اور سرور ڈنڈا میموریل سوسائٹی کی جانب سے ایک شاندار جشن منعقد ہوا تھا جس میں انھیں کیسہ زر بھی پیش کیا گیا۔ اس طرح جہاں دار افسر کی سیاسی، سماجی، ادبی و شعری خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں ان کی موجودگی ہی میں کیا گیا۔ ورنہ ہمارا معاشرتی مزاج ہمیشہ سے مردہ پرستی کا رہا ہے ''زوال نعمت کے بعد ہمیں قدر نعمت کی جستجو ہوتی ہے''

جہاں دار افسر صفی اورنگ آبادی کے بلند پایہ اور قدآور شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں. انھوں نے حضرت صفی سے نہ صرف اپنے کلام پر اصلاح لی بلکہ علم عروض بھی سیکھا اور اس پر دسترس حاصل کی وہ ۱۹۵۰ء تک غزل کے پرستار رہے ان کے ابتدائی دور کے کلام میں غزل کا روایتی انداز

خاصہ نمایاں نظر آتا ہے ۔ وہ ایک پرگو شاعر ہیں ان کی شاعری کی دس بیاضیں گم ہوگئیں اگر وہ بیاضیں موجود رہتیں تو انکے غزل کے رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی "کھلی آنکھوں کے خواب" میں انھوں نے اپنی پچاس غزلیں شامل کی ہیں جو ان کے حقائق زندگی، واقعات زندگی، سانحات زندگی، مشاہدات زندگی اور تجربات زندگی کا ایک صحیفہ ہیں ان کے ابتدائی کلام پر صفیؔ کا گہرا اثر نمایاں ہے صفیؔ کے فیض نے انھیں خوش بیانی کا سلیقہ عطا کیا چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

فیضِ اخلاص و عنایت ہے صفیؔ کا افسرؔ
تم سے شاعر بھی جواب حسنِ بیان تک پہنچے

جہاں دار افسرؔ کی غزلوں میں زبان بیان کے لطف کے علاوہ ایسے مضامین بھی ملتے ہیں جو ان کے پیش رو کہہ چکے ہیں لیکن جہاں دار افسرؔ نے ان مضمحل اور مردہ لفظوں میں بھی نئی روح پھونک دی ہے انھوں نے بعض غزلیں ایسی بھی کہی ہیں جس میں خاص طور پر ردیفوں پہ توجہ دی گئی ہے لیکن ان میں بھی انھوں نے لفظی اور معنوی حسن پیدا کرنیکی کوشش کی ہے۔ گذشتہ صفحات میں ہم نے اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہاں دار افسرؔ نے ردیفوں کو ایک اعلیٰ مقصد ثور معنی و مفہوم کی گہرائی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

جہاں دار افسرؔ نے اپنی غزلیات میں لفظی تراکیب کا خاص خیال رکھا ہے جس کا وجہ سے ان کی غزلوں میں بڑی رمزیت پائی جاتی ہے اس کی بھی کئی مثالیں پیش کی جاچکی ہیں جہاں دار افسرؔ نے حسن و عشق کی کیفیات، درد و غم کے شدید احساس، زندگی کے فلسفے، انسانی مسائل اور سماجی تصورات کو اپنی غزلوں میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ فنی لحاظ سے بھی لفظیات کے مناسب استعمال، معنوی خوبیاں، بندشِ شعر، بحروں کے انتخاب اور موسقیت ان کے مزاج شعری کا پتہ دیتی ہے۔ اگر ہم ان کے کلام کا تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی شعری حسیت ان کے خارجی اور داخلی کیفیات سے معروض وجود میں آئی ہے۔ اور ان کے غزلوں میں ان کے دردمند دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔

جہاں دارافسرؔ ایک انقلابی ہیں وہ ہمیشہ ترقی پسند تحریک کے طرف دار رہے اس لئے انکی شاعری میں عام لوگوں کی زندگی کا کرب اور ان کے بہتر مستقبل کے خواب بھی ملتے ہیں ان کی شاعری میں جو سماجی شعور جھلکتا ہے وہ ترقی پسند تحریک کی دین اور اسے وابستگی کا نتیجہ ہے اسی لئے ان کی شاعری کا اہم مقصد یہی رہا ہے کہ ایک آدمی کو اس کی مجبوریوں سے آزاد کیا جائے اور اسے انسانیت کا درس دیکر اس کے صحیح مقام سے آگاہ کیا جائے ایک لحاظ سے ان کی شاعری میں اصلاحی تحریک کارفرما نظر آتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ان کی شاعری میں جدید رجحانات بھی ملتے ہیں. پرانی تہذیب کے دلدادہ ہونے کے سبب جہاں روایتی انداز ملتا ہے رموز و علائم میں جہاں ساقی و پیمانہ کا ذکر ہے وہیں شیخ و کعبہ بھی نظر آتے ہیں انھوں نے گُل و بلبل اور شمع و پروانہ کی فرسودگی سے اپنے دامن شعری کو بچائے رکھا ہے لفظی تراکیب سے کام لیتے ہوئے پیرایہ اظہار کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کلام میں عصری حسیت موجود ہے ہر شاعر کے پاس عمر کے لحاظ سے فکر و فن میں تغیر نظر آتا ہے۔ جیسا کہ رابرٹ فراسٹ کا قول ہے کہ ''شاعری مسرت سے شروع ہوتی ہے اور بصیرت تک پہنچتی ہے'' فراسٹ کا یہ بیان جہاں دارافسرؔ پر پوری طرح صادق آتا ہے کہ انھوں نے ہنستے کھیلتے شاعری کا آغاز کیا اور اب مسرت سے گذر کر بصیرت کے منازل کامیابی کے ساتھ طے کر رہے ہیں۔

جہاں دارافسرؔ جہاں ایک کامیاب غزل گو ہیں وہیں ایک کامیاب نظم نگار بھی ہیں ان کی نظموں میں جہاں ان کے ذاتی جذبات و حالات کی جلوگری ہے وہیں تحت الشعور میں ایک عام انسان کے جذبات کی بھی ترجمانی ملتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف جہاں دارافسرؔ کی شخصیت شاہی خاندان کی تہذیب کا نمونہ ہے تو دوسری طرف عصری تقاضوں کی ملی جلی تہذیب بھی ان کی فکر سے دامن گیر ہے۔ وہ پرانی تہذیب کے بھی دلدادہ ہیں اور نئی تہذیب کی روشن خیالی کے معترف بھی اس نظریاتی کشمکش میں انھوں نے آنے والے حالات و واقعات سے ایک پاکیزہ رشتہ استوار کیا۔ ایک بیدار ذہن کے لئے ایسا سوچنا ضروری بھی تھا۔ وہ احترام آدمیت کو مقدم جانتے ہیں. ترقی پسند تحریک نے ''ادب برائے زندگی'' کا جو نعرہ دیا اس کی وہ قدر کرتے ہیں وہ زندگی سے مایوسی اور فرار کو پسند نہیں

کرتے وہ حالات کے تپتے ہوئے صحرا میں پیاسی زندگی کو جینے کا حوصلہ دیتے ہیں یہی پیغام ان کی نظموں میں ملتا ہے۔

جہاں دار افسرؔ کی نظموں میں بھی عصری حسیت نمایاں ہے انھوں نے اپنی معراء نظموں میں احساس کی انفرادیت کی جوت جگانے کی کامیاب کوشش کی ہے انھوں نے زخم خوردہ سماج کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ان کی شاعری میں نوجوان نسل کیلئے ایک ایسا پیغام ہے جس میں عمل وحرکت کی تلقین کی گئی ہے۔ انھوں نے جہاں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے وہی مزدوروں محنت کش طبقات کی بھی بھرپور ترجمانی اور نمائندگی کی ہے۔ جہاں دار افسرؔ کی معریٰ نظموں میں عروضی آہنگ بھی برقرار ہے انھوں نے اپنی نظموں میں سادگی، سلاست اور سوز وگداز کے مجموعی تاثر کو قائم رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

غرض کہ جہاں دار افسرؔ نے اپنے کلام میں چاہے وہ غزلیں ہوں یا نظمیں صوتی آہنگ کو مختلف انداز سے ابھار کر کہیں روانی، کہیں سادگی، کہیں نغمگی، کہیں جمالیاتی کیف، کہیں عشق سرمستی اور کہیں وارفتگی اور کہیں ذوق جنوں کو پروان چڑھا ہے جو ہر لحاظ سے ان کی کامیاب شاعری کی کھلی دلیل ہے اس طرح صوتی آہنگ کے لئے جہاں دار افسرؔ نے مختلف انداز سے ردیف وقوافی کے استعمال سے ایک کامیاب شاعری کے جوہر دکھلائے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ علم عروض پر انھیں عبور حاصل ہے۔ وہ ہر لحاظ سے عصر حاضر کے ترقی پسند شعراء میں منفرد حیثیت کے مالک ہیں ان کا فلسفہ حیات ان کی شاعری میں خون حیات بن کر دوڑ رہا ہے یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ جہد وعمل سے بھرپور زندگی گذارنے کے باوجود انھوں نے کیفیت اور قیمت دونوں اعتبار سے شعر وسخن کا ایک وقیع سرمایہ ''کھلی آنکھوں کے خواب'' کے عنوان سے ہمارے حوالے کیا ہے۔ جہاں دار افسر بنیادی طور پر انقلابی شاعر ہیں انھوں نے صحافت کو اپنا پیشہ بنایا۔ اس پیشہ میں انھوں نے ۱۹۴۶ء میں قدم رکھا ان کا نصف صدی سے زیادہ عرصہ اس مقدس پیشہ میں گذر گیا انھوں نے پوری ایمان داری اور صحافتی دیانتداری کے ساتھ اس پیشہ کو اپنایا۔ وہ ایک اچھے صحافی، ایک اچھے کالم نگار اور ایک ماہر اداریہ

نولیس کی حیثیت سے صحافتی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں ان کے پیش نظر ہمیشہ صحافت کے بلند و اعلیٰ اقدار رہے ہیں ۔

وہ ۱۹۴۶ء میں روزنامہ ''نظام'' سے وابستہ ہوئے اس اخبار میں ۱۹۴۹ء تک وہ اداریہ لکھتے رہے اور دوسری صحافتی ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے۔ اس اخبار کے وہ جائنٹ ایڈیٹر اور محمد علی کلیم اس روزنامہ کے ایڈیٹر تھے اس اخبار کی پالیسی مخالف جاگیر شاہی تھی اس لئے اس اخبار پر نظام شاہی حکومت کا عتاب رہا محکمہ اُمور داخلہ کے حکم سے اس اخبار کے اداریوں پر احتساب عائد کیا گیا تھا اور حکم ملا تھا کہ وزارت داخلہ حکومت حیدرآباد کی تصدیق کے بغیر کوئی اداریہ راست شائع نہ کیا جائے۔ چنانچہ ادارہ روزنامہ نظام نے فیصلہ کیا کہ کوئی اداریہ معتمد داخلہ کی تصدیق و توثیق کے لئے نہیں بھیجا جائے گا بلکہ ہر روز اداریہ کی جگہ ایک طنزیہ شعر شائع کیا جائے گا جس سے جاگیر شاہی پر چوٹ لگتی ہے اس سلسلہ میں مقالہ نگار سے جہاں دار افسر نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ ایک بار ایک سرکاری تقریب میں اس وقت کے وزیر اُمور دستوری نواب علی یاور جنگ سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے جہاں دار افسر سے کہا کہ آپ کی اس نئی شرارت پر کیا کیا جائے ......؟ جس کے جواب میں جہاں دار افسر نے کہا تھا ''ظلم کے ہاتھ دراز ہوتے ہیں مگر جہاں دار افسر حق گوئی اور بے باکی کو ترک نہیں کرے گا'' اس سلسلہ کا ایک اور واقعہ بھی جہاں دار افسر نے سنایا وہ بھی ان کے اداریوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ جہاں دار افسر کا بیان ہے کہ ایک روز پولیس اسٹیشن کالی کمان کے انسپکٹر دفتر روزنامہ نظام آئے اور اطلاع دی کہ ایڈیٹر نظام اور اداریہ نولیس کے لئے کوئی فرمان کنگ کوٹھی مبارک سے وزیر داخلہ نواب دین یار جنگ کے پاس آیا ہے۔ دونوں عزیز باغ سلطان پورہ میں ان سے ملاقات کریں۔ دونوں عزیز باغ گئے اس فرمان کی کاپی اُنھیں نہیں دی گئی۔ فرمان میں جہاں دار افسر کے نام کے بہ جائے (J.A) کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے نواب دین یار جنگ بہادر سے جہاں دار افسر کے والد صاحبزادہ میر افتخار علی خاں مرحوم اور خسر صاحبزادہ میر کفایت علی خاں مرحوم کے ذاتی اور شخصی مراسم تھے اس لئے نواب دین یار جنگ بہادر نے بحیثیت صدر ناظم کوتوالی ( ڈائرکٹر

جنرل پولیس ) جہاں دار افسرؔ سے کبھی نرم کبھی گرم گفتگو کی جس میں شفقت کا پہلو زیادہ تھا۔ جب انھوں نے جہاں دار افسرؔ سے کہا کہ آپ لوگ شہر بدر بھی کئے جا سکتے ہیں تو وہ یہ کہتے ہوئے عزیز باغ سے نکل گئے۔

ملکِ خدا تنگ نیست
پائے گدا لنگ نیست

پولیس ایکشن کے بعد جہاں دار افسرؔ روز نامہ ہمارا اقدام سے وابستہ ہوئے جو مدینہ بلڈنگ سے نکلتا تھا اس اخبار میں بھی وہ اداریہ لکھتے رہے جہاں دار افسرؔ کے اداریوں پر شہریار عابدی ایڈیٹر جیل کی ہوا کھاتے رہے یہی حشر ''نیا زمانہ'' کے ایڈیٹر احمد افسر کا بھی ہوا۔ جہاں دار افسرؔ معین فاروقی کے روز نامہ انگارے میں بھی برسوں اداریہ لکھتے رہے اس کے علاوہ شہر اور اضلاع کے کئی ہفتہ وار جرائد میں انھوں نے اداریہ نویسی کی۔

جہاں دار افسرؔ روز نامہ پیام (ایڈیٹر اختر حسن) روز نامہ مشیر دکن (ایڈیٹر داس دیو) اور روز نامہ جوہر میں بحیثیت مترجم کام کیا ان میں ترجمہ کی غیر معمولی صلاحیت ہے ۔ یہاں اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ جہاں دار افسرؔ حیدرآباد کے مختلف خبر رساں ایجنسیوں سے وابستہ رہے ہیں اور گہرا صحافتی تجربہ حاصل کیا ہے وہ رحیم فریادی کے ساتھ پبلک نیوز سروس میں کلیدی فرائض انجام دئے ۔ اس کے علاوہ پریس ایکس چینج میں بھی کام کیا جو حیدرآباد کے مشہور روز نامہ میزان کی نیوز ایجنسی تھی اس میں اسوسی ایٹ نیوز سروس کے رضا علی اور سید یوسف الدین مرحوم کے ساتھ خبر رسانی کا کام کیا۔ عبدالحق کاہش حیدرآبادی' محمد علی عثمانی اور مرتضی مجتہدی سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ جہاں دار افسرؔ نے الف۔ن۔س ماڈرن نیوز سروس' گرانٹ نیوز سروس' اور بے شمار خبر رساں اداروں سے بحیثیت رپوٹر اور مترجم وابستہ رہے۔ اور وسیع تجربہ حاصل کیا۔ انڈین نیوز ایجنسی کے نام سے خود انھوں نے اپنا ایک خبر رساں ادارہ قائم کیا تھا۔ جہاں کئی نوجوان صحافیوں کی انھوں نے تربیت بھی کی اب پیوپلز نیوز سروس ایجنسی چلا رہے ہیں۔ غرض حیدرآباد کی اردو صحافت سے جہاں دار افسرؔ کا

گہرا تعلق رہا بے شمار اخبارات اور نیوز ایجنسیوں میں کام کرنے کے بعد وہ روزنامہ سیاست سے وابستہ ہوئے۔اور برسوں بحیثیت سب ایڈیٹر اور اسٹاف رپورٹر کام کیا۔ اور وہیں سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے سیاست سے سبکدوش ہونے کے باوجود بھی وہ آج تک کوہ پیما کی حیثیت سے شیشہ و تیشہ کے کالم میں سوالات کے بڑے دلچسپ جواب دیتے ہیں۔ابتداء جہاں دار افسر شیشہ و تیشہ کا مزاحیہ کالم بھی لکھا کرتے تھے۔

اُردو اخبار میں مزاح کا کالم ایک بہت بڑا ورثہ ہے اُردو صحافت کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو میں کئی مزاحیہ اخبار بھی جاری ہوئے بعد میں مزاحیہ کالموں نے ان کی جگہ لے لی ۔حیدرآباد میں قاضی عبدالغفار نے اپنے روزنامہ ''پیام'' میں ''سرراہ'' سے اُردو اخبار کے مزاحیہ کالم کو ایک بلند مقام بخشا۔ یہ روایت ''سیاست'' نے بھی جاری رکھی روزنامہ سیاست میں یہ کالم مشہور شاعر شاہد صدیقی ملک الشعراء اوج یعقوبی اور ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین لکھا کرتے تھے ان کے بعد برسوں یہ کالم جہاں دار افسر کے زورِ قلم کا نتیجہ رہا۔ وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ ہر جمعہ کو کوہ پیما کی حیثیت سے شیشہ و تیشہ میں سوالات کے جوابات دیتے ہیں جو بڑے دل چسپ اور اکثر فکر انگیز ہوتے ہیں کاش ادارہ سیاست ان کا مزاحیہ کالم شیشہ و تیشہ شائع کرے کیوں کہ کوہکن کا تیشہ طنز و مزاح کے ادب میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

جہاں دار افسر اکٹوبر ۱۹۹۸ء سے روزنامہ منصف میں ایک کالم ''حیدرآباد دیدہ و شنیدہ مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا جس کی (۷۵) قسطیں شائع ہو چکی ہیں چند دلچسپ عنوانات ملاحظہ ہوں۔

''مہاراجہ کشن پرشاد کی دیوڑھی کا محرم' ایوان شاد کے مشاعرے' سال گرہ ہمایونی کا مشاعرہ' حضرت بزم آفندی' مخدوم محی الدین کی نظم پر فرمان' اُردو کے عرب شعراء' سرکردہ علماء و مشائخین' سالار جنگ ہال نظام کالج کے مشاعرے' سروجنی نائیڈو افکار و اقدار' پیرس یونیورسٹی میں صفی اور امجد کی

پذیرائی' نیاز حیدر اور حیدر آباد' اُردو ادبی سمینار اور اُردو فروغ کی مساعی' شہزادہ نواب مبارز الدولہ' حیدر آباد میں خبر رسانی' حیدر آباد میں بزم اقبال' بہادر یار جنگ کا درس قرآن اور اقبال' زندہ دلی کے روشن چراغ' آزادی صحافی کے علمبردار' حیدر آباد کا فلمی دنیا سے تعلق ' فلمی صنعت میں حیدر آبادیوں کا حصہ' مرقع سخن حصہ اول و دوم' کنول پرشاد کنول کی مقبولیت' حیدر آباد میں ابتدائی سیاسی مراکز' کنگ کوٹھی پر کالی جھنڈیوں کا مظاہرہ' صاحبزادہ میکش کی سخاوت' دواخانہ عثمانیہ سے ڈاکٹر گوڑ کی فراری' پولیس ایکشن سے پہلے ڈاکٹر گوڑ کی آنکھ مچولی' دیپاولی کی خوشیوں میں نظام سابع اور مہاراجہ کی شرکت' نظام سابع گرجا گھروں میں' حیدر آباد علم وفن کا مرکز' حیدر آباد کے غزل گائک' حیدر آباد میں جگر مراد آبادی' حضرت مہذب لکھنوی اور حضرت صفی اورنگ آبادی' چار مینار کے خوش نویس' شعر وادب میں پولیس ایکشن کا تذکرہ' حیدر آباد میں سال نو' نظام سابع کے گرجا گھروں کو تحفے' دیوڑھی قادر الدولہ انقلابیوں کا اڈا' اختر حسن کے گھر پر ہمہ وقتی نگرانی' پولیس ایکشن کے بعد' وغیرہ وغیرہ اگر ان کالموں کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو یہ گذشتہ حیدر آباد کی ادبی سماجی' معاشرتی اور ثقافتی سرگرمیوں پر ایک معتبر اور مستند کتاب کی حیثیت حاصل کر لے گی۔ آج کل وہ روز نامہ منصف میں ''آئینہ شہر'' کے سلسلہ میں ''چار مینار کے دامن میں'' کے عنوان سے ایک کالم لکھ رہے ہیں۔ جو تا حال جاری ہے جس میں بڑی حق گوئی اور بے باکی سے عوام کے حقوق اور مفادات کی ترجمانی کر تے ہیں۔ یہ کالم بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے .اور بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

غرض جہاں دار افسر پیشہ کے اعتبار سے صحافی اور مزاج و مشغلہ کے لحاظ سے شاعر ہیں حضرت صفی اورنگ آبادی کے شاگرد اور دبستان صفی کے ایک قد آور شاعر ہونے کے باوجود فکری مناسبت سے ان کا ذہنی جھکاؤ ہمیشہ ترقی پسند شعر وادب کی طرف رہا۔ مخدوم محی الدین اور سلیمان

اریبؔ وغیرہ کے ساتھ انکے شب و روز گذرے عوام کے دکھ درد میں ہمیشہ شریک رہے اس لئے انکی شاعری حیات آمیز اور حیات آموز ہے۔ وہ ہمیشہ جمہوریت سیکولرازم اور قومی یکجہتی کی آواز بنے رہے۔ نظم معرا اور غزلیں بہت عمدہ اور بڑے سلیقہ سے کہتے ہیں ان کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ ان کی شاعری پر کوئی خاص چھاپ محسوس نہیں ہوتی بقول جسٹس سردار علی خاں ''جہاں دار افسرؔ حیات وکائنات کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھتے اور ذہن کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ان کی نظر عصری تقاضوں اور جدید ادبی تجربوں پر ہوتی ہے'' جہاں دار افسرؔ کا بیان ہے کہ وہ برسہا برس سے ترقی پسند ادبی تحریک کے ہم سفر ہیں مگر خود کو جدید دور کا انسان مانتے ہیں۔ اور جدید ادبی تجربوں کو قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایسی تخلیقات کو نہ پسند کرتے ہیں جن میں زندگی سے فرار کا احساس جنم لے یا دل سے حرکت کی بہ جائے جمود کی ترغیب ہو یہی وجہ ہے کہ وہ کلاسکی ترقی پسند اور جدید طرز فکر کے مکاتب میں وہ یار شاطر سمجھے جاتے ہیں اور کسی کے لئے بار خاطر نہیں ہیں۔

# شجرۂ نسب جہاں دارافسر

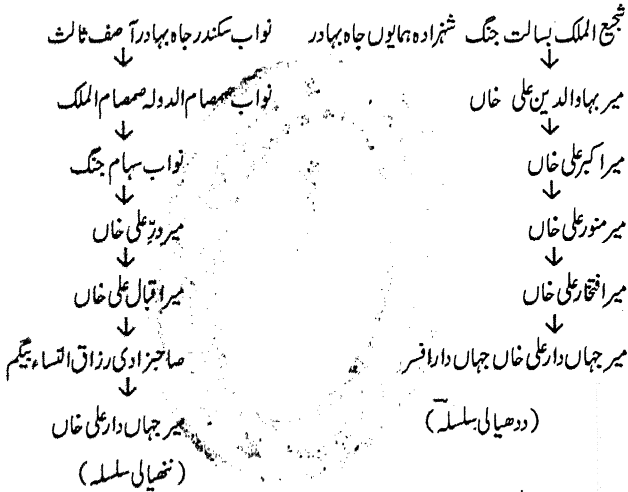
## حصہ اول

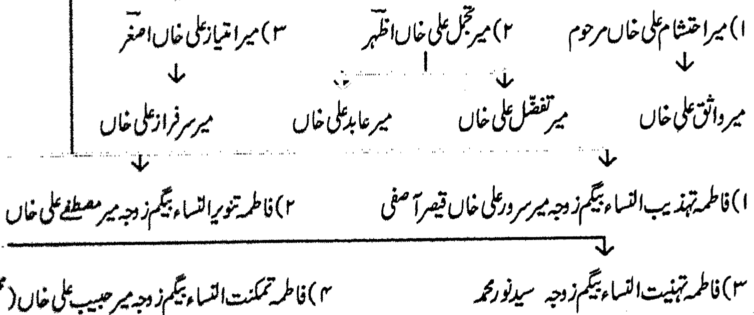
۱) خلیفہ اوّل امیر المومنین حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ
↓
۲) حضرت محمد بن ابوبکر صدیقؓ
↓
۳) حضرت ابوالقاسمؒ
↓
۴) حضرت عبدالرحمٰن مکیؒ
↓
۵) حضرت عبداللہ النضرؒ
↓
۶) حضرت محمد قاسمؒ
↓
۷) حضرت نصیرالدین النضرؒ
↓
۸) حضرت قاسم (علی رومیؒ)
↓
۹) حضرت حسینؒ
↓
۱۰) حضرت سعدؒ
↓
۱۱) حضرت عبداللہ بعمویہؒ
↓
۱۲) حضرت محمد عبدالرزاق
↓
۱۳) حضرت عبداللہ بغدادیؒ
↓
۱۴) حضرت محمد الکبریٰ سہروردیؒ
↓
۱۵) شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ
↓
۱۶) حضرت ابوالحفص محمدؒ

۱۷) قطب الاقطاب زین الدینؒ
↓
۱۸) حضرت شیخ علاؤالدینؒ
↓
۱۹) حضرت شیخ تاج الدینؒ
↓
۲۰) حضرت شیخ فتح اللہؒ
↓
۲۱) حضرت شیخ نجیب اللہؒ
↓
۲۲) حضرت شیخ فتح اللہ ثانیؒ
↓
۲۳) حضرت شیخ جاوید ملقب سرمستؒ
↓
۲۴) حضرت شیخ فتح اللہ شیخ ثانیؒ
↓
۲۵) حضرت شیخ جاوید شاہ ثانیؒ
↓
۲۶) حضرت محمد شیخ ادریسؒ
↓
۲۷) حضرت شیخ محمد مومنؒ
↓
۲۸) حضرت شیخ محمد عالم شیخؒ
↓
۲۹) حضرت خواجہ عزیزاں سمرقندی
↓
۳۰) حضرت شیخ خواجہ میر اسماعیل ملک العلماء عالم العلماءؒ
↓
۳۱) نواب الحاج خواجہ میر عابد قلیچ خان بہادر شہیدؒ
↓
۳۲) نواب میر غازی الدین علی خانؒ

## ﴿حصہ دوم﴾

۴۳) میر قمرالدین علی خاں آصف جاہ اوّل



# کتابیات



| سلسلہ نشان | نام مصنف | نام کتاب | ناشر | سنہ اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | احتشام حسین سید | اردو ادب کی تنقیدی تاریخ | ترقی اردو بیورو، نئی دہلی | ۱۹۸۸ء |
| ۲ | احسن فاروقی، ڈاکٹر محمد | اردو تنقید | | |
| ۳ | احمد علی الہام واحدی میر | شاب اورنگ آبادی (مقالہ یم فل) | غیر مطبوعہ | |
| ۴ | اعجاز حسین | مختصر تاریخ ادب اردو | | |
| ۵ | اعظمی خلیل الرحمٰن | اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک | | |
| ۶ | افضل الدین اقبال، ڈاکٹر | جنوبی ہند میں اردو صحافت | | ۱۹۸۱ء |
| ۷ | انور علی دہلوی | اردو صحافت | اردو اکیڈیمی دہلی | ۱۹۸۷ء |
| ۸ | جمیل جالبی | ارسطو سے ایلیٹ تک | | |
| ۹ | جہاں دار افسر | کھلی آنکھوں کے خواب | ادبی مرکز، حیدر آباد | ۱۹۹۴ء |
| ۱۰ | جواد رضوی سید محمد | ریاست حیدر آباد میں جدوجہد آزادی (۱۸۰۰ء تا ۱۹۰۰ء) | سلسلہ مطبوعات ترقی اردو بیورو | ۱۹۹۲ء |
| ۱۱ | حامد لطیف ملتانی قادری | سلطان العلوم اور ان کی علمی خدمات | انتخاب پریس | ۱۹۹۳ء |
| ۱۲ | رعنا حیدری، ڈاکٹر | سکندر علی وجد حیات اور شاعری | ہشام کتاب گھر اورنگ آباد | ۱۹۹۹ء |
| ۱۳ | رفیعہ حیدری، ڈاکٹر | حیدر آباد | | |
| ۱۴ | زمن راج سکسینہ | تذکرہ دربار حیدر آباد | سلسلہ مطبوعات ترقی اردو بیورو | ۱۹۸۸ء |
| ۱۵ | سروری، پروفیسر عبدالقادر | اردو کی ادبی تاریخ | | |
| ۱۶ | سلام سندیلوی، ڈاکٹر | غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ | | |
| ۱۷ | عبدالستار ردلوی، پروفیسر | اردو میں لسانی تحقیق | کوکل اینڈ کمپنی، بمبئی | ۱۹۷۱ء |
| ۱۸ | عبدالستار ردلوی، پروفیسر | تحقیق و تنقید | | |
| ۱۹ | عبدالقیوم خاں باقی | رسالہ الموسیٰ یادگار دہلی | | |
| ۲۰ | علی احمد جلیلی، ڈاکٹر | فصاحت جنگ جلیل شخصیت و شاعری | | |

| سلسلہ نشان | نام مصنف | نام کتاب | ناشر | سنہ اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| ۲۱ | فرمان فتحپوری | اقبال سب کے لیے | فاران آفسٹ پریس دریا گنج دہلی | ۱۹۸۱ء |
| ۲۲ | کلیم الدین احمد، پروفیسر | اردو تنقید پر ایک نظر | | |
| ۲۳ | کمال احمد صدیقی | آہنگ اور عروض | ترقی اردو بیورو نئی دہلی | ۱۹۸۹ء |
| ۲۴ | گیان چند، پروفیسر | تحقیق کا فن | | |
| ۲۵ | گیان چند، پروفیسر | اقبال کا فن | ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی | ۱۹۸۳ء |
| ۲۶ | محمد علی حسینی ایس اے روف | بازگشت (ایورتاثر) | بزم سخن حیدرآباد | ۱۹۹۵ء |
| ۲۷ | محمد علی حسینی ایس اے روف | جہاں دار افسر شخص اور عکس | ڈیموکریٹس اسوسی ایشن حیدرآباد | |
| ۲۸ | محی الدین قادری زور ڈاکٹر | (مرتبہ) کیف سخن | ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد | |
| ۲۹ | محی الدین قادری زور ڈاکٹر | (مرتبہ) مرقع سخن جلد اول و دوم | ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد | |
| ۳۰ | محی الدین قادری زور ڈاکٹر | عہد عثمانی میں اردو کی ترقی | ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد | |
| ۳۱ | مراد علی طالع | نظام الملک آصف جاہ اول | ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد | |
| ۳۲ | مراد علی طالع | نظام علی خاں آصفجاہ ثانی | ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد | |
| ۳۳ | مراد علی طالع | سکندر جاہ آصف جاہ ثالث | ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد | |
| ۳۴ | مراد علی طالع | ناصر الدولہ آصف جاہ رابع | ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد | |
| ۳۵ | مراد علی طالع | افضل الدولہ آصف جاہ پنجم | ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد | |
| ۳۶ | مراد علی طالع | محبوب علی خاں آصف جاہ سادس | ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد | |
| ۳۷ | مسعود حسین خاں | مقدمہ شعر و زبان | حیدرآباد | ۱۹۶۶ء |
| ۳۸ | مغنی تبسم، ڈاکٹر | فانی بدوانی شخصیت و شاعری | | |
| ۳۹ | مغنی تبسم، ڈاکٹر | اردو زبان کے اصوات مقالہ فانی بدایونی | | |
| ۴۰ | نصیر الدین ہاشمی | دکن میں اردو (آٹھواں ایڈیشن) | ترقی اردو بیورو نئی دہلی | ۱۹۸۵ء |
| ۴۱ | مہدی عابدی | خطۂ مجاہدین | بزم سفیران انقلاب حیدرآباد | |
| ۴۲ | یوسف حسین خاں | اردو غزل | | |



موسیٰ اقبال، پرنسپل آرٹس کالج ٹی موہن سنگھ اور خان لطیف خان مدیر اعلیٰ روزنامہ منصف ڈاکٹر عقیل ہاشمی،
پروفیسر بیگ احساس صدر شعبۂ اردو آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی دیکھے جاسکتے ہیں